جموں کشمیر کے منتخب اُردو افسانے

(پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک)

(جلد اوّل)



سلیم سالک

جموں و کشمیر کے منتخب اُردو افسانے

(پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک)

جلد اوّل

مرتبہ و مقدمہ

سلیم سالکؔ

میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

ISBN.978-93-80-691-

نام کتاب: جموں وکشمیر کے منتخب اُردو افسانے (جلد اوّل)

نوعیت : افسانوی انتھالوجی

مرتب : سلیم سالکؔ

سنہ اشاعت: ۲۰۱۱

قیمت : 350/=

کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

سرورق : بشیر احمد

ناشر : میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

Title :Jammu kashmir kay muntakib urdu afsanay

Edited : Salimsalik

Price : 350/=

Publisher : Meezan Publishers
Opp.Fire & Energency Service Hqrs
Batamaloo Srinagar,Kashmir
Pin code: 190009
Mob: 9419002212
Email:meezanpublishers@rediffmail.com

اهتمام
شبیر احمد

انتساب

ریاست کے کہنہ مشق اردو افسانہ نگار

جناب نور شاہ

اور

کشمیر کے مخلص صحافی

جناب جاوید آذر

کے

نام

ترتیب

افسانوں کے انتخاب نے ......!!

۲۰۰۵ء کی بات ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ارتضیٰ کریم ایک توسیعی لیکچر دینے کے لئے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی تشریف لائے۔ انہوں نے اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے کئی باتیں کیں۔ میں نے موضوع کی مناسبت سے پروفیسر موصوف سے استفسار کیا کہ جب بھی افسانوں کے حوالے سے تنقیدی مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں کہیں بھی ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کا ذکر نہیں ملتا، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ میرے سوال پر کچھ دیر توقف کرنے کے بعد انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ریاست کے افسانہ نگار بیرون ریاست سے شائع ہونے والے رسائل میں نہیں چھپتے یا اُن کو نظر انداز کیا جاتا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اردو میں معیاری افسانے لکھنے سے قاصر ہوں۔ حقائق کی نشاندہی ہونے کے بعد میں نے مصمم ارادہ کیا کہ ریاست جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے حوالے سے ایک جامع انتخاب ترتیب دوں، جس سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہوسکے کہ ریاست کے افسانہ نگاروں کو معیاری افسانے لکھنے ہی نہیں آتے ......!!

پہلے پہل میں نے ریاست کے افسانہ نگاروں کی ایک فہرست تیار کی، تو مجھے حیرت ہوئی جب ایک سو سے زائد افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست تیار ہوگئی۔ ہر افسانہ نگار کو شامل انتخاب کرنا ممکن نہیں تھا، تو کئی دنوں کی محنت شاقہ کے بعد کل چھبیس افسانہ نگاروں کی ایک حتمی فہرست بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ باقی افسانہ نگاروں کی تخلیقات معیاری نہیں۔ لیکن انتخاب کو ایک محدود دائرے میں ہی رہ کر ترتیب دیا جاسکتا ہے ورنہ یہ کام کبھی پایہ تکمیل نہ پہنچ ہوسکتا۔

جب میں نے اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ڈول ڈالا، تو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ افسانہ نگاروں نے ''مجذوب کی بڑ'' سمجھ کر نظر انداز کر دیا، تو کسی نے درخور اعتناء بھی نہیں سمجھا۔ کچھ افسانہ نگاروں کی تخلیقات پڑھ کر حیرت ہوئی کہ اُن کو افسانہ نگار کس لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ تو پروفیسر موصوف کی بات یاد آ گئی کہ یہاں معیاری افسانہ لکھے ہی نہیں گئے ہیں۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے میں نے پھر اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کیا تو کچھ مثبت نتائج سامنے آئے۔

ریاست میں اُردو افسانے کی انتھالوجی کے حوالے سے کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں موہن یاور کی کتاب ''توی اور جہلم'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سولہ افسانہ نگاروں کو شاملِ انتخاب کیا گیا ہے۔ نند گوپال باوا نے ۱۹۶۴ء میں ''آدم کے بیٹے'' کے عنوان سے کتاب مرتب کی۔ جس میں چھ افسانے اور ایک ڈراما شامل ہے۔ مدن موہن شرما نے ''نثار تیری گلیوں پہ'' مرتب کی جس میں چودہ افسانے شامل ہیں۔ نور شاہ نے کلچرل اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام ۱۹۷۳ء میں ''انتخاب اُردو ادب ...... ۴۷ سے ۷۱ تک'' مرتب کی۔ جس میں ''بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ'' کے عنوان کے تحت افسانوں کے لئے ایک گوشہ مخصوص ہے۔ اس گوشہ میں ریاست جموں و کشمیر کے ۲۳ افسانہ نگاروں کے افسانے شامل ہیں۔ اس کے ردِ عمل میں ڈاکٹر بشیر گاش نے ۱۹۷۴ء میں ''ارمغان کاشمر'' ترتیب دی، جس میں وادی کے ۳۱ افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے لیکن جموں اور لداخ کے افسانہ نگاروں کو یکسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ البتہ ''ارمغان کاشمر'' اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے جس میں ''حجابات'' کے عنوان کے تحت سات خواتین افسانہ نگاروں کو بھی متعارف کیا گیا ہے۔

رسائل کے حوالے سے زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ شیرازہ اردو کا ایک ضخیم افسانہ نمبر ۱۹۷۷ء میں رشید نازکی کی ادارت میں شائع ہوا، جس میں اردو کے سولہ، کشمیری کے ۲۱، ڈوگری کے ۴ اور پنجابی کے ۴ افسانے شامل ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی کا سالنامہ ''ہمارا ادب'' بھی اس حوالے سے قابل ذکر ہے کیونکہ ہر سال اس میں منتخب افسانے شامل کئے جاتے تھے۔ حال ہی میں ''لفظ لفظ'' کا افسانہ نمبر (۲۰۱۰) شائع ہوا۔ جس میں کل ۳۶ افسانے شامل ہیں جس میں ریاستی ادیبوں کے ۲۲ افسانے ہیں۔

جب میں نے اس بات پر غور کیا کہ ریاست کے افسانہ نگاروں کو پروان چڑھنے میں ہمیشہ دقتیں کیوں پیش آئی ہیں تو میری نظر میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی ادبی رسالہ متواتر نہیں نکلا ہے اگرچہ سرکاری سطح پر کلچرل اکیڈیمی کا ''شیرازہ'' اور محکمہ اطلاعات کا ''تعمیر'' نکلتے ہیں لیکن ایک عرصہ سے ''تعمیر'' کی اشاعت میں بھی ناغہ ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ جن ادیبوں نے انفرادی کوششیں کیں۔ وہ بھی زیادہ دیر تک بارآور نہیں ہوسکیں۔ ان میں ہما (ظفر یحییٰ) سویرا (ویدراہی، وید گپتا) پریم (نرسنگھ داس نرگس) نگینہ (وحشی ساحل سعید) سنگم (موہن یاور) جہات (حامدی کاشمیری) لفظ لفظ (زاہد مختار) حکیم الامت (اکبر حیدری) صدا (نسرین نقاش) اور بزم ادب (ابن اسماعیل) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو رسائل کی کمی کو یہاں کے مقامی اخبارات نے پورا کیا ہے۔ جن میں خدمت، ہمدرد، وتستا، چاند، آفتاب، سری نگر ٹائمز، آئینہ، کشمیر عظمیٰ وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔

افسانوں کے انتخاب کے بارے میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک مرتب کے ساتھ اختلاف کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ ہر انتخاب کی طرح اس انتخاب کی بھی اپنی مجبوریاں اور حد بندیاں ہیں۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود کچھ معیاری افسانے شامل انتخاب نہ ہوسکے۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ انشاء اللہ ان کو کتاب کی دوسری جلد میں شامل کیا جائیگا۔

میں شکرگزار ہوں ان افسانہ نگاروں کا جنہوں نے میری گزارش پر اپنے افسانے ارسال کئے، یہاں تک کہ بعض حضرات نے افسانوں کے مجموعے بھی عنایت کئے۔

میں اس بات کا کھلے دل اعتراف کرتا ہوں اگر محترم نور شاہ صاحب میری رہنمائی نہ کرتے تو میری یہ کوشش کبھی بارآور نہیں ہوسکتی تھی۔ انہوں نے ذاتی کتب خانے کے دروازے میرے لئے ہمیشہ کھلے رکھے۔ جس کے لئے میں ان کا بہت ہی مشکور ہوں۔ محترم شبیر ماٹجی (مالک میزان پبلشرز) کی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ یہ مسودہ کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہیں ورنہ میں نے تو اس انتخاب کو چھاپنے کا ارادہ ہی ترک کردیا تھا۔ انہوں نے حسب سابق میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس مسودہ کو دیمک زدہ ہونے سے بچالیا۔

میں اپنے دوستوں میں ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی، پیرزادہ ارشاد احمد، اصغر رسول، سلیم ساغر، ناصر ضمیر اور جنید جاذب کا بہت ہی شکر گزار ہوں جن کی سنجیدہ گفتگو سے مجھے ریاست جموں و کشمیر کے اردو افسانے میں مزید دلچسپی پیدا ہوگئی۔ عزیزی رؤف راحت کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر ممکن معاونت کی۔

سلیم سالکؔ
سری نگر کشمیر

تاریخ
۱۱جون ۲۰۱۰

مقدمہ

بیسوی صدی کو افسانہ کی صدی قرار دیا گیا ہے کیونکہ اُردو افسانہ نے اپنی کمسنی میں جو منازل طے کرلیں ہیں وہ شاید ہی کسی دوسری صنف سخن نے طے کیں ہوں۔ اُردو افسانہ ابتداء سے ہی کثیر الجہت ہونے کی وجہ سے زیر بحث رہا ہے۔خواہ وہ رومانیت ہو یا حقیقت پسندی، ترقی پسندی ہو یا جدیدیت، اجتماعیت ہو یا فردیت، تجریدیت ہو یا مابعد جدیدیت، ہر دور میں اُردو افسانہ تیزی سے عروج کی منزلیں طے کرتا رہا۔ جہاں تک جموں و کشمیر میں اردو افسانے کا تعلق ہے یہاں بھی اردو افسانہ دیگر ریاستوں کے شانہ بشانہ آٹھ دہائیوں سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو نثر کے باقاعدہ نمونے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ملتے ہیں۔ جن میں ہر گوپال خستہ کی نثری کتاب ''گلدستہ کشمیر'' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو زبان کی مقبولیت کو دیکھ کر ڈوگرہ دور کے مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اس کو باضابطہ طور پر سرکاری زبان کا دیا۔ اسی دور میں اردو زبان کا چلن عام ہوا اور ساتھ ہی شعروشاعری کی محفلوں کا بھی آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد شعری ادب کے ساتھ ساتھ اردو افسانہ کی کونپلیں بھی پھوٹنے لگیں۔ اور بیسوی صدی کی تیسری دہائی سے باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اس ضمن میں پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر برج پریمی کی گراں قدر تحریریں حرف اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ریاست میں اُردو افسانہ نگاری کے آغاز کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

''افسانہ نگاری کا آغاز یہاں بھی، اس میں شک نہیں کہ روایتی،

رومانی اور کسی حد تک رسمی انداز سے ہوا، لیکن جوں ہی ان ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور فن پر دسترس کا ایقان پیدا ہو گیا۔ ان کی اپنی ذاتی صلاحیتیں اُبھرنے لگیں اور اپنی سرزمین کی حقیقی زندگی کے سماجی، معاشی، نفسیاتی اور بعض وقت سیاسی پس منظر والے افسانے سرانجام دیئے جانے لگے۔ جس سے جموں اور کشمیر کے افسانوں میں مقامی رنگ اور انفرادیت نمایاں ہونے لگی۔ ...... افسانہ نگاری میں سب سے عظیم نام جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ پنڈت پریم ناتھ پردیسی ہے۔" [1]

اس طرح سروری کے بیان کو پڑھ کر دو چیزیں سامنے آتی ہیں کہ یہاں پہلے پہل روایتی اور رسمی انداز میں افسانے تخلیق کئے گئے اور پریم ناتھ پردیسی کو عظیم افسانہ نگار گردانا گیا ہے۔ لیکن آگے چل کر سروری صاحب تیرتھ کاشمیری کا تعارف کرواتے ہوئے معاملے کی نوعیت ہی بدل دیتے ہیں:۔

"پریم ناتھ پردیسی نے افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک خصوصی مقام حاصل کر لیا ہے لیکن ان سے کچھ پہلے ہی پنڈت شیام لال ولی، جو تیرتھ کاشمیری کے نام سے لکھتے رہے اور کشمیر میں اور کشمیر کے باہر ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی، میدان میں آچکے تھے۔ تیرتھ فراواں نگار ہیں۔ انہوں نے سو کے قریب افسانے لکھے ہیں۔ اسی تعداد میں ان کے مضامین ہیں جو مذہب، اخلاق اور تاریخ کے وسیع موضوعات پر حاوی ہیں۔ انہوں نے ڈراما پر بھی طبع آزمائی کی اور ادبِ لطیف کے انداز کے مختصر انشائیے بے شمار لکھے اور وہ شعر بھی کہتے ہیں اور پردیسی کی تخلیقی صلاحیتوں کا پھیلاؤ بھی انہیں اصناف تک تھا لیکن پردیسی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد چمک اُٹھے۔ تیرتھ کی ملازمت کی پابندیاں ان کے قلم کے لئے رکاوٹ بنی رہیں۔" [2]

---

[1]: کشمیر میں اردو ..... جلد دوئم، صفحہ نمبر ۴۳۰، سنہ اشاعت ۱۹۸۲

[2]: کشمیر میں اردو ..... جلد دوئم صفحہ نمبر ۴۴۱/۴۲، سنہ اشاعت ۱۹۸۲

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ تیرتھ کاشمیری پردیسی سے پہلے افسانے لکھ رہے تھے کیونکہ تیرتھ کاشمیری نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز ۱۹۲۳ء میں بحیثیت افسانہ نگار کیا جبکہ پریم ناتھ پردیسی ۱۹۲۴ء میں بحیثیت شاعر متعارف ہوئے اور ۱۹۳۲ء کے بعد ہی باقاعدہ افسانے لکھنے شروع کئے۔ تیرتھ کاشمیری نوکری کی وجہ سے پس منظر میں چلے گے جب کہ پردیسی ترقی پسند تحریک کی بدولت چمک اُٹھے۔ سروری تیرتھ کاشمیری پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "۱۹۲۳ء سے تیرتھ نے قلم اُٹھایا اور اب تک بے تکان لکھ رہے ہیں اس عرصے میں ان کا کئی اخباروں کی ترتیب سے بھی تعلق رہا، لیکن نام کے ساتھ نہیں۔...... تیرتھ اپنے افسانوں کے لئے مواد ہر گوشے سے حاصل کرتے ہیں اور انہیں نئے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ، دساتیر، عام زندگی اور اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے میں انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً چندراولی، اندھی ماں، تلاش حق، جگ چھوٹا سرمایہ اخلاقی پہلو لئے ہوئے ہیں۔" [1]

سروری کی ان باتوں سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ جموں و کشمیر کا پہلا افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نہیں بلکہ تیرتھ کاشمیری ہے۔ لیکن اس بات سے بھی مفر نہیں کہ تیرتھ کاشمیری کے افسانے اخلاقی موضوعات کی وجہ سے ایک مخصوص خول میں سمیٹ کر رہ گئے تھے۔ اس کے برعکس پردیسی نے زندگی کے متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے اعلیٰ پائے کے افسانے تخلیق کئے، جس سے پردیسی کی ایک خاص پہچان بن گئی اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ریاست کا پہلا افسانہ نگار کون ہے اس معاملے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب "پریم ناتھ پردیسی...... عہد، شخص اور فنکار" میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "ریاست میں نثر کی طرف غالباً محمد دین فوق مرحوم نے سب سے پہلے توجہ کی اور کچھ تاریخی اور نیم تاریخی قصے لکھے۔ اس کے

---

[1]: کشمیر میں اُردو...... جلد دوئم، صفحہ نمبر ۴۴۴، سنہ اشاعت ۱۹۸۲

بعد چراغ حسن حسرت کا افسانوی مجموعہ ''کیلے کا چھلکا اور دیگر افسانے'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔لیکن اس صنف کو باضابطہ اور باقاعدہ طور پر پریم ناتھ پردیسی نے ایک نیا رنگ دیا۔''[۱]

اس اقتباس سے کئی چیزوں کا خلاصہ ہوتا ہے۔فوق ریاست کا پہلا نثر نگار ہے جبکہ فوق سے قبل ہرگوپال خستہ کی نثری تصنیف ''گلدستہ کشمیر'' منظر عام پر آچکی تھی۔ اب اگر یہاں نثر کو فکشن سمجھ کر بات کی گئی ہو تو وہاں بھی سالگرام سالک کی تصنیف ''داستان جگت روپ'' سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔مذکورہ اقتباس میں چراغ حسن حسرت کا افسانوی مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہونے کی اطلاع فراہم کی گی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حسرت نے پردیسی سے پہلے افسانے لکھنے شروع کئے ہیں۔تو ان کو پہلا افسانہ نگار ماننے میں کیا قباحت ہے۔ آخر پر پریم ناتھ پردیسی کو''باضابطہ اور باقاعدہ'' ایک نیا رنگ دینے والا افسانہ نگار قرار دیا گیا ہے۔

یہاں پر برج پریمی فوق کو پہلا نثر نگار تسلیم کرتے ہیں۔جبکہ دوسری جگہ وہ ہرگوپال خستہ کو پہلا نثر نگار مانتے ہیں۔اس طرح برج پریمی خود تضاد کا شکار ہوتے ہیں اور مزید آگے ریاست کا پہلا افسانہ نگار کا قضیہ یہ کہہ کر یکسر ختم کرتے ہیں کہ:

> ''پردیسی کشمیر کے غالباً سب سے پہلے اور سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں، انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اس صدی کے تیسرے دہے کے آغاز میں کیا تھا۔وہ سب سے پہلے رونق کے تخلص سے ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔''[۲]

یہاں بھی پردیسی کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار گردانتے وقت ''غالباً'' کا سہارا لینا پڑا ہے جو کہ تحقیقی اصولوں کے منافی ہے۔میری متذکرہ باتوں کی توثیق خود برج پریمی بھی کرتے ہیں:

(۱) ''ہرگوپال خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ان کی

۱: پریم ناتھ پردیسی......عہد، شخص اور فنکار، مرتبہ ڈاکٹر پریمی رومانی، صفحہ نمبر ۸۲، سنہ اشاعت ۲۰۰۹

۲: پریم ناتھ پردیسی......عہد، شخص اور فنکار، مرتبہ ڈاکٹر پریمی رومانی، صفحہ نمبر ۸۲، سنہ اشاعت ۲۰۰۹

''گلدستہ کشمیر'' اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے جو عہد قدیم سے لیکر مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور میں شائع ہوئی۔''[۱]

(۲) ''نثر کے شعبے میں فوق نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ان میں جیسا کہ ذکر ہوا تاریخی، سوانحی اور قصہ کہانیوں کی تصانیف بھی شامل ہیں۔...... ریاست میں اردو فکشن کی طرف فوق نے ہی سب سے پہلے توجہ دلائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ کشمیر میں باضابطہ طور پر انہوں نے اردو فکشن کی طرح ڈالی تو بے جا نہیں ہوگا۔ فوق نے جیسا کہ ذکر ہوا روشن زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلم بند کیے۔ جنہیں ہم ریاست میں اردو فکشن کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کس سے متاثر ہوئے لیکن بہر حال ان کے طبع زاد قصوں میں کہانی کا بنیادی کینڈا ضرور ملتا ہے۔''[۲]

(۳) ''ناول نگاری کی طرف سالگرام سالک کے ساتھ ساتھ مولوی محمد الدین فوق نے بھی شروعات کیں۔ سالک کی تصنیف داستان جگت روپ ناول سے زیادہ ایک داستان ہے اور اس میں پلاٹ در پلاٹ تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مولوی محمد الدین فوق کی اس سلسلہ میں بہتر کوششیں ملتی ہیں۔ ان میں خاص طور پر اکبر اور انارکلی نام کے دو تاریخی قصے اہم ہیں۔ جن کو ہم بیسویں صدی کے دوران لکھے ہوئے اولین اُردو ناول کہہ سکتے ہیں۔ انارکلی سنہ ۱۹۰۰ء میں اور اکبر سنہ ۱۹۰۹ء میں لاہور سے شائع ہوئے۔''[۳]

---

[۱]: جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما...... ڈاکٹر برج پریمی، صفحہ نمبر ۱۴۳، سنہ اشاعت ۲۰۰۴، ایڈیشن ۳

[۲]: جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما...... ڈاکٹر برج پریمی، صفحہ نمبر ۱۵۱، سنہ اشاعت ۲۰۰۴، ایڈیشن ۳

[۳]: جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشو ونما...... ڈاکٹر برج پریمی، صفحہ نمبر ۱۵۱، سنہ اشاعت ۲۰۰۴، ایڈیشن ۳

پروفیسر عبدالقادر سروری اور ڈاکٹر برج پریمی کی دلیلوں کو مدنظر رکھ کر جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ اس طرح ہیں:۔

ا۔ ریاست کی پہلی نثری کتاب ہرگوپال خستہ کی ''گلدستہ کشمیر'' ۱۸۸۳ء میں لاہور میں شائع ہوئی۔[۱]

۲۔ ریاست کی پہلی داستان سالگرام سالک کی ''داستان جگت روپ'' ہے جو اشاعت پذیر نہیں ہوسکی۔

۳۔ ریاست کا پہلا ناول ''انارکلی'' محمد دین فوق نے ۱۹۰۰ء میں لاہور میں شائع کیا۔

۴۔ ریاست کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ اس سوال کے جواب میں ایک مثلث قائم ہوتا ہے۔ جس میں تیرتھ کاشمیری، چراغ حسن حسرت اور پریم ناتھ پردیسی اُبھرتے ہیں۔

جب اس مسئلہ پر باریک بینی اور سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو تیرتھ کاشمیری کے افسانے اخلاق اور وعظ و پند کے دائرے میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں، تکنیک اور اسلوب کے حوالے سے ان میں انشائیہ پن زیادہ ملتا ہے اس لئے ان کو اس دور میں زیادہ اہمیت نہیں ملی۔ چراغ حسن حسرت بسیار نویس تھے وہ کئی اخباروں کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر لاہور میں ہی قیام پذیر ہوتے۔ ان کی تحریریں مضامین اور کالم کی نوعیت کی ہوتیں تھیں۔ چراغ حسن حسرت کے متعلق محمد دین فوق اپنی کتاب ''تاریخ اقوام پونچھ'' میں رقمطراز ہیں۔

> ''اخباری دنیا میں آپ (حسرت) ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن اصلیت یہ ہے کہ آپ ایک قابل مصنف اور ایک بے بدل شاعر ہیں۔ کتابیں آپ نے بہت لکھیں اور قریباً ہر مضمون پر لکھیں، لیکن اپنے نام سے کوئی کتاب شایع نہیں کی۔''[۲]

---

[۱]: ہرگوپال خستہ کی تحریر کردہ تاریخ ''گلدستہ کشمیر'' کی تاریخ اشاعت میں اختلاف ہیں۔ سروری اور برج پریمی کے نزدیک ۱۸۸۳، جبکہ حبیب کیفوی ۱۸۷۲، منظر اعظمی اور حامدی کاشمیری ۱۸۷۳ کی تاریخ مانتے ہیں۔

(س۔س)

[۲]: تاریخ اقوام پونچھ..... محمد دین فوق، صفحہ نمبر ۶۱۶، سنہ اشاعت ۲۰۰۹

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''کیلے کا چھلکا'' جس کی تاریخ اشاعت برج پریمی نے ۱۹۲۷ قرار دیا ہے صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ فوق کا مذکورہ بیان ۱۹۳۴ کے بعد کا ہے۔ بسیار تلاش کے بعد بھی مجھے کہیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ''کیلا کا چھکا'' افسانوی مجموعہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی اس بات سے پردہ اُٹھا سکے۔

اس کے برعکس پریم ناتھ پردیسی شاعری ترک کر کے افسانہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فنی اور ہیتی عناصر کا بھرپور شعور ملتا ہے۔ انہوں نے شخصی راج کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے کئی شاہکار افسانے تخلیق کئے ہیں۔ اسی لئے پریم ناتھ پردیسی کو ریاست کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا گیا ہے۔ اور برج پریمی کی تحقیق کے مطابق پردیسی کا پہلا افسانہ ''سچی پراتھنا'' روزنامہ ''رنبیر'' جموں، جلد ۷، نمبر ۳۶، اپریل ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔[۱]

یہاں اس بات کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ ریاست کے اردو افسانے کے حوالے سے ابھی تک کوئی مستند اور معیاری کام نہیں ہوا ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں اس حوالے سے کچھ نئی باتیں سامنے آئیں، کیونکہ تحقیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

ریاست میں ''اردو افسانے کا سفر'' کو میں نے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ہر دور میں اردو افسانہ کی تشکیل و تعمیر اور مزاج و منہاج میں جو رجحانات و میلانات محرک بنے ہیں ان کو مدنظر رکھ کر ہی اردو افسانہ کے خد و خال سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

(۱) دورِ اوّل ...... (۱۹۳۰ تا ۱۹۵۵)

(۲) دورِ دوئم ...... (۱۹۵۵ تا ۱۹۷۵)

(۳) دورِ سوم ...... (۱۹۷۵ تا ۲۰۰۰)

(۴) دورِ چہارم ...... (۲۰۰۰ تا حال)

۱: برج پریمی نے اپنی کتاب ''پریم ناتھ پردیسی...... عہد، شخص اور فنکار'' کے صفحہ نمبر ۱۲۶ پر پردیسی کے ان افسانوں اور نثر پاروں کی تفصیل دی ہے جو پردیسی کے کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ اسی فہرست میں مذکورہ افسانے کی تاریخ اشاعت درج ہے۔ (س۔س)

پہلا دور......(۱۹۳۰تا۱۹۵۵)

اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں یہاں افسانے روایتی اور رومانی انداز میں لکھے جانے لگے۔ ہم ان افسانہ نگاروں کو فراموش نہیں کرسکتے جنہوں نے اس ابتدائی دور میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس سے بعد میں آنے والوں کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔ اگر چہ ان روایتی افسانہ نگاروں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن ماحول کو سازگار بنانے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔ ان میں تیرتھ کاشمیری (چندراولی، اندھی ماں، تلاش حق)، پنڈت دینا ناتھ واریکو المعروف شاہد کاشمیری (ملاپ، بکھان، ایجاد، انتقام)، پنڈت شیام لال ایمہ (عیار ڈاکو، غربت، لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا)، پنڈ گنگا دھر بھٹ دیہاتی کاشمیری (جوتا، میری پیاری)، شیام لال کبو (حرمانِ نصیب، غربت، اوشا)، دینا ناتھ عارض (دل کی تڑپ)، گوپی ناتھ مٹو (خونی)، پنڈت منوہر کاک (قربانی)، پنڈت شمبو ناتھ جی کول (محبت)، پنڈت ویدلال گیرو (حرماں نصیب شانتا)، پنڈت سومناتھ جی (عجب چور)، پرتھوی ناتھ کول (کنیا آشرم)، شری بت رعناوری (بھولا پیار) اور شریمتی سوہن رانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بقول سروری شریمتی سوہن رانی اس دور کی خواتین افسانہ نگاروں میں نمائندہ تھیں۔

متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کی کوششوں سے ایک ایسی کھیپ سامنے آئی جنہوں نے آگے چل کر افسانہ کی تاریخ رقم کی۔ اس سلسلے میں سروری یوں لکھتے ہیں:

> "۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کے درمیان، کشمیر میں کئی اچھے افسانہ نگار منظر عام پر آئے اور یہ صنف اتنی مقبول ہوئی تھی کہ اکثر ذوق رکھنے والے قابل مطالعہ افسانے آسانی کے ساتھ لکھ لیتے تھے۔[۱]

ریاست میں جب افسانہ کی آمد شروع ہوئی تو یہاں تخلیق کاروں کے سامنے زندگی کے نجی مسائل کے ساتھ ساتھ شخصی راج کے ظلم و ستم کی روداد بھی قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، جیسے ان کو احساس ہوگیا تھا کہ تخلیق کار پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی عکاسی بھی کرے۔ اسی لئے تخلیق کار کے ذاتی رنج و غم کی کوئی

۱: کشمیر میں اردو...... جلد دوئم، صفحہ نمبر ۴۵۷

وقعت نہیں رہی۔ برج پریمی پردیسی کا ذکر کرتے وقت اس دور کی عکاسی یوں کرتے ہیں:۔

''یہ وہی دور تھا جب ڈوگرہ شاہی کا جبر واستبداد کشمیری عوام کی جڑوں کو کھوکھلا کر چکا تھا۔ وہ غلام در غلام زندگی بسر کرتے ہوئے چلے آرہے تھے اور اب مزید بے بسی، لاچاری اور غربت میں پسے جا رہے تھے۔ پردیسی کا ذاتی رنج و ملال اجتماعی رنج وغم کا حصہ بن گیا۔ ملک پر چاروں طرف جاگیر دارانہ اور چک دارانہ نظام کے خونین پنجے پیوست ہو چکے تھے۔ چک داری نظام کے تحت زمین داروں اور چک داروں کا استحصال نوکر شاہی، رشوت خوری، ناخواندگی اور اقتصادی نابرابری کا دور دورہ تھا۔'' [1]

لیکن جوں ہی ریاست میں ترقی پسند تحریک کی لہر پہنچ گئی۔ تو ہر طرف اسی رو۔حجان کی آبیاری ہونے لگی۔ یہاں کے ادیبوں کا شعور بیدار ہوا اور وہ روایتی اور رومانی موضوعات کے ساتھ ساتھ باقی مسائل پر بھی سوچنے لگے۔ اور انہوں نے باقاعدہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی نابرابری، سیاسی استحصال، لاچاری و مفلسی اور طبقاتی کشمکش جیسے موضوعات کی عکاسی شروع کردی۔ وادی میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد کیا پڑ گئی کہ لکھنے والوں کا ایک کارواں سامنے آیا۔ نور شاہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا واردِ کشمیر ہونے پر لکھتے ہیں:

''وادی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۴۶ء میں رکھی گئی۔ اس میں اردو میں لکھنے والے کم و پیش سبھی ادیب اور شاعر شامل ہوئے۔ اس انجمن کی کارکردگیوں میں ایک اہم سرگرمی اس کی ہفتہ وار مجلسوں کا انعقاد تھا، جو ہر جمعہ کو ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں میں چھوٹے بڑے سبھی ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے جن پر جوش وخروش اور دیانت داری سے بحث ہوا کرتی تھی۔'' [2]

۱: پریم ناتھ پردیسی......عہد، شخص اور فنکار، مرتبہ ڈاکٹر پریمی رومانی، صفحہ نمبر ۴۰، سنہ ۲۰۰۹

۲: انتخاب اردو ادب......مرتبہ نور شاہ، صفحہ نمبر ۷، سنہ ۱۹۷۳

گر چہ بعض لوگ ترقی پسند ادب کو پروپگنڈہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو فروعی اور مصنوعی کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ریاست میں اردو زبان وادب کے ارتقاء میں ترقی پسند تحریک کے رول کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔اسی تحریک کی بدولت عوام میں شخصی راج کے خلاف ایک زوردار مہم کا آغاز بھی ہوا۔

اس دور میں جن افسانہ نگاروں نے باقاعدہ ایک کاروں کی شکل اختیار کی۔ان میں پریم ناتھ پردیسی،قدرت اللہ شہاب،رامانند ساگر،پریم ناتھ در،کشمیری لال ذاکر، محمود ہاشمی،ٹھاکر پونچھی،نرسنگھ داس نرگس،کنول نین پرواز،کوثر سیمابی،موہن یاور،جگدیش کنول،سومناتھ زتشی قابل ذکر ہیں۔جبکہ ڈاکٹر گوری شنکر کے خاندان نے اردو افسانے کی ترویج میں خاصا رول ادا کیا،جن میں کرشن چندر،مہندر ناتھ اور سرلا دیوی کے نام آج بھی لئے جاتے ہیں۔

بدقسمتی دیکھئے کہ ابھی افسانہ کے بیج سے کونپلیں نکلنے شروع ہوگئیں تھیں کہ تقسیم کا سانحہ پیش آیا۔جس سے پورے برصغیر میں اتھل پتھل شروع ہوئی اور زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی۔ اس سانحہ کے اثرات براہ راست ہماری ریاست پر بھی پڑ گئے۔یہاں کے حالات بھی دگرگوں ہوگئے،ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہوگیا۔سیاسی اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔اور جو لکھنے والوں کا کاروں سامنے آگیا تھا وہ بھی دیکھتے دیکھتے بکھر گیا۔ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ پاکستان ہجرت کرگئی۔جن میں قدرت اللہ شہاب، کوثر سیمابی،کیف اسرائیلی،محمد عمر نورالہی،طالب گورگانی،عزیز گاش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اور بعض افسانہ نگار تلاش معاش کے سلسلے میں بیرون ریاست چلے گئے جن میں ٹھاکر پونچھی،پریم ناتھ در،کشمیری لال ذاکر،کنول نین پرواز،رامانند ساگر قابل ذکر ہیں۔ جو ادیب وشعراء یہاں رہے وہ کلچرل فرنٹ کے بینر تلے جمع ہونے شروع ہوگئے جن میں زیادہ تر وہی ادیب تھے جو ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔بقول نور شاہ:

> "۱۹۴۷ کے اواخر اور ۱۹۴۸ کے اوئل میں کشمیر وادی میں ایک تمدنی محاذ یعنی کلچرل فرنٹ کی بنیاد رکھی گئی۔اس محاذ میں سب سے پہلے جن لوگوں نے شمولیت کی وہ یہی ترقی پسند ادیب اور شاعر تھے،یہ وہ زمانہ تھا جب نیم برصغیر تقسیم ہو چکا تھا۔دو نئی مملکتیں وجود میں

آ چکی تھیں ۔ مہاجرین کا مسئلہ نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا اور ادھر اپنے کشمیر پر حملہ ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ ایک عجیب طرح کی افراتفری، طوائف الملوکی اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔ اس پس منظر میں تمدنی محاذ یعنی کلچرل فرنٹ کا وجود میں آنا اور ترقی پسند مصنفین کا اس میں رضا کارانہ طور پر شامل ہونا ریاست کی ادبی تحریک میں ایک سنہری باب کا درجہ رکھتا ہے۔'' [1]

سانحہ تقسیم کے ساتھ ہی سے ہر طرف فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جس سے ریاستی ادیب بھی متاثر ہوئے ۔ جب بھی فسادات کے حوالے سے اُردو کے کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہاں ٹھاکر پونچھی کا ''بلور خان'' اور پریم ناتھ در کا '' آخ تھو'' بھی شمار کیا جاتا ہے ۔ پریم ناتھ در کا افسانہ '' آخ تھو'' پر معروف نقاد ممتاز شیریں رقمطراز ہیں:

''پریم ناتھ در کا افسانہ '' آخ تھو'' ایک اظہاری کیفیت ہے جو خارجی حقیقت ہی کا ایک عکس ہے۔ وہ عکس جو فنکار کا احساس دیکھتا ہے۔ جہاں انسان انسان کا گوشت پکار کر کھاتا ہے۔ درمیان میں اسے اپنی دنیا کی تصویریں بھی دکھائی دیتی رہتی ہیں اور یہ زیادہ غلیظ، کریہہ اور گھناؤنی نظر آتی ہے۔ پریم ناتھ در افسانے میں انتہائی گھناونے پن اور کراہیت کا احساس بدرجہ اتم لے آنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ یہ سارا افسانہ ہی مجسم طنز ہے۔ انسان کی بربریت پر کئی افسانوں میں طنز کی گئی ہے لیکن اس کا جواب نہیں''۔ [2]

غرض اس دور کا افسانہ جہاں رومانی اور روایتی موضوعات سے دامن چھڑا کر ڈوگرہ دور کی نقاب کشائی کرتا ہے تو وہاں کشمیریوں کے بھائی چارے کی بھی مثال پیش کرتا ہے ۔ ساتھ ہی سانحہ تقسیم کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ فسادات کو بھی ہدف ملامت بنانے سے نہیں کتراتا ہے۔ اگر چہ اس دور میں تخلیق کاروں کے لئے

---

[1]: انتخاب اردو ادب..... مرتبہ نور شاہ، صفحہ نمبر ۷، سنہ ۱۹۷۳

[2]: بحوالہ ''فسادات اور ہمارے افسانے''..... ممتاز شریں ، ذہن جدید جلد ۴، شمارہ ۱۴ صفحہ نمبر ۱۸

وسائل اور رسائل دنوں ناپید تھے پھر بھی مقامی اخباروں کی بدولت یہاں ایک ایسی فضا قائم ہوگئی جس سے تخلیق کاروں کی پیاس کسی حد تک بجھ جاتی۔ ان اخباروں میں رنبیر، ہمدرد، وتستا، چاند، مارٹنڈ، خدمت قابل ذکر ہیں۔

دوسرا دور (۱۹۵۵......۱۹۷۵)

جوں ہی تقسیم کے بعد حالات سدھرے تو نئے لکھنے والوں کی ایک اور کھیپ سامنے آئی۔ جنہوں نے ادبی افق پر نمودار ہوتے ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو افسانہ کو موضوعاتی اور ہیتی سطح پر چار چاند لگائے۔ بالغ نظری اور کشادہ ذہنی سے افسانے کے دامن کو وسعت بخش کر مغربی نظریات کو بھی خوش اسلوبی سے برتا۔ جن میں فرائڈ کا نظریہ جنس خاصا مقبول رہا۔ اگر اس دور کو افسانہ کا زریں دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ان افسانہ نگاورں میں علی محمد لون، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، پشکر ناتھ، اختر محی الدین، ، نور شاہ، غلام رسول سنتوش مخمور بدخشی، امیش کول، رام کمار ابرول، برج کتیال، وید راہی، جگدیش بھارتی، برج پریمی، صوفی غلام محمد وغیرہ اہم ہیں۔ لیکن جلد ہی علی محمد لون، اختر محی الدین، غلام رسول سنتوش، صوفی غلام محمد، بنسی نردوش کشمیری میں افسانے لکھنے لگے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ اگر علی محمد لون اور اختر محی الدین اردو میں ہی لکھتے تو ان کا شمار انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مین را جیسے بلند پایہ افسانہ نگاروں کے صف میں ہوتا۔ اس دور کے افسانہ نگاورں کے شانہ بشانہ پریم ناتھ در، کشمیری لال ذاکر، رامانند ساگر، کنول نین پرواز، موہن یاور، ٹھاکر پونچھی برابر لکھتے رہے۔

۶۰ کی دہائی میں پورے ہندوستان میں جدیدیت کا چلن عام تھا۔ جدیدیت کی اندھی تقلید میں تخلیق کاروں نے روایتی نکتہ نظر چھوڑ کر علامتی اور تجریدی تحریریں لکھنے کو ہی ترجیح دی۔ جس سے کہانی بھی متاثر ہوگئی، یہاں تک کہ افسانہ تجریدیت اور علامت کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو گیا کہ قاری کہانی کی لذت سے محروم ہوگیا۔ بعض افسانہ نگاروں نے ریاضی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے لئے کہانی کا کینواس ہی چنا، جس سے عام قاری کہانی سے بہت دور ہوگیا۔ اس ساری صورت حال پر وہاب اشرافی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"افسانہ نگار اجتماعیت کی فضا کو اچانک تج دینے پر آمادہ ہوگیا اور اچانک ہی ذات کے خول میں سمٹ گیا اور اتنے ہی اچانک طور پر قدروں کی شکست وریخت کا اسے عرفان بھی حاصل ہوگیا اور رشتے ناتے کے ٹوٹنے کے احوال اس پر منکشف ہوگئے اور وہ بھری دنیا میں تنہائی سے دوچار ہوگیا اور وہ اپنی زندگی کے لمحے لمحے کا احساس کرنے لگا، پھر اس کی لغویت بھی اس پر آشکارہ ہوگئی اور وہ راتوں رات وجودی بن گیا اور تلازموں کے سلسلے اس پر روشن ہوگئے، تب وہ شعور اور لاشعور کے نہاں خانوں میں جھانکنے لگا اور ان کی رو میں بہنا اس کا مقدر بھی بن گیا اور اس کا فن بھی۔ تب اس کے فن نے اسے تجرید کا سبق دیا، پھر اس راہ سے وہ علامت نگاری کی منزل میں آ گیا۔ اردو افسانے کی حد تک مجھے اس کا یقین ہے کہ یہ سب کچھ نہیں ہوا، ہاں روایتی اور آزمودہ سانچے میں قصہ گوئی اس کے لئے مشکل ضرور ہوگئی کہ ایسے سانچے پرانے لکھنے والوں کے ہاتھوں اتنے پک گئے تھے کہ انہیں مزید پکایا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کا احساس نئی نسل کے فنکاروں کو تو تھا ہی لیکن اس کے مظاہرے کے لئے موثر پلیٹ فارم کی ضرورت تھی، اسی کمی کو پورا کرنے میں "سوغات" نے پہل کی، پھر "شب خون" نے بڑے طمطراق سے صلائے عام دے دی۔ اس طرح نئے افسانہ نگاروں نے اور نئے افسانے کی کھیپ پیدا ہوگئی۔" [1]

اس طرح جدیدیت کے باقاعدہ اثرات ہماری ریاست کے تخلیق کاروں میں بھی جا بجا نظر آنے لگے۔ وہ بھی اجتماعیت کے بجائے انفرادیت پر زور دینے لگے۔ اس صورت حال کا جائزہ پروفیسر محمد اسد اللہ وانی اس طرح لیتے ہیں:۔

"اس دور میں جموں وکشمیر کے نئے لکھنے والوں نے ایک طرف ملک گیر پیمانے پر اردو ادیبوں کے سبک کی پیروی کی اور یہاں کے

---

[1] بحوالہ: مقدمہ...... آزادی کے بعد اردو افسانہ، جلد اول، صفحہ نمبر ۱۲

معاشی وسماجی پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھی۔ دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر مروج رجحانات مثلاً مارکس کے معاشی اور فرائیڈ کے جنسی خیالات کا اثر بھی قبول کیا اور اس طرح سے مارکسزم اور تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ وجودیت ،اشاریت ،اظہاریت ، تاثریت ، جمالیات ،شعور کی رو جیسے جدید نظریات سے متاثر ہو کر افسانے تخلیق کرنے کی کوشش کی۔'' [1]

۶۵ ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے میدان ادب میں قدم جمانے کے لئے تگ ودو شروع کردی۔ ان میں مالک رام آنند، کلدیپ رعنا، عمر مجید، ظہور الدین، موتی لال کپور، حسن ساہو، گھنشیام سیٹھی ، وریندر پٹواری، شبنم قیوم ، جوتیشور پتھک ، شمس الدین شمیم ، وجے سوری ، ہردے کول بھارتی ، کشور مجندہ ، امر مالموہی، خالد حسین ، ریاض پنجابی، وحشی ساحل سعید، عبدالغنی شیخ ، اجیت کمار بخشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تیسرا دور (۱۹۷۵......۲۰۰۰)

ساتویں دہائی میں اس کاروں کے ساتھ ایک اور تازہ دم تخلیق کاروں کی کہکشاں شامل ہوگئی۔ جن میں آنند لہر، جان محمد آزاد، زاہد مختار، دیپک بدکی ،اشوک پٹواری، غلام نبی شاہد، مشتاق مہدی ، انیس ہمدانی ، فاروق رینزو، م۔م۔صدیق ، ایس ایم قمر، بشیر شاہ ،عبدالرشید فراق، بشیر گاش ،الطاف ناؤپوری ، شیخ بشیر احمد، طالب حسین رند، کے ڈی مینی ، جبکہ خواتین افسانہ نگاروں میں ایم نساء ، واجدہ تبسم ،فرحت آرا حیدری، نیلوفر شاعر، زینت فردوس زینت اور ترنم ریاض وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس بات کو ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ریاست میں جدیدیت کے اثرات ساتویں دہائی سے باقاعدہ دکھائی دے۔ پروفیسر نصرت چودھری اس بارے میں اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''ساتویں دہائی میں معاصرین کے ساتھ چند نوجوان افسانہ نگار بھی سامنے آئے جنہوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہوئے تغیرات اور رجحانات کا گہرا اثر قبول کیا۔ ملکی سطح پر ابھرنے والے نئے علامتی

---

[1] : بحوالہ ''جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے نئے افق''۔۔ ہمارا ادب ۱۹۷۸، صفحہ ۳۴۹

افسانہ نگار سرندر پرکاش، انتظار حسین، بلراج مین رااور انور سجاد کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ مغرب کے اہم علامتی اور وجودی مفکرین جیمز جائس، ورجینا ولف، ایلیٹ، سارتر، کاموا اور کافکا کے اثرات بھی قبول کئے اور مغربی رجحانات اور تحریکات مثلاً وجودیت، اشاریت، سرئیلزم کے افسانے پر پڑتے ہوئے اثرات کا جائزہ بھی لیا۔ اور دوسری جانب جب انہوں نے اپنے گردوپیش کی زندگی کا جائزہ بھرپور انداز میں لیا تو انہیں زندگی قدرے بدلی ہوئی نظر آئی۔ چنانچہ کئی ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جنہوں نے عصر حاضر کی زندگی کو نئے افسانے میں پیش کیا ہے۔''[1]

جن افسانہ نگاروں نے فنی اور تکنیکی سطح پر اپنے تجربات کو افسانوں میں علامتی انداز میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔ ان میں بشکر ناتھ، ظہور الدین، عمر مجید، مشتاق مہدی، زاہد مختار، آنند لہر، خالد حسین، وریندر پٹواری، طالب حسین رند، خصوصیت کے حامل ہیں۔

آٹھویں دہائی میں باقاعدہ مابعد جدیدیت کا اعلان کیا گیا تو ہر طرف آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں، کہانی کی بازیافت اور قاری کی اہمیت پر تبصرے ہونے لگے۔ مابعد جدیدیت کے ماہر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس صورت حال کے پیش نظر کچھ سوالات قائم کئے:

''نیا افسانہ دراصل اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود معلوم نہیں کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے۔ وہ ایک ایسے آئینے کے روبرو ہے جو شکستوں سے چور ہے۔ نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ ڈھانچے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کیا نئی کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچے کا ایسا عنصر ہے جس کا رد لازم ہے؟ کہانی خواہ وہ کتنی ہی انام، تجریدی، استعاراتی، تمثیلی یا فنطاسیائی ہو، کیا کہانی پن کے بغیر اس کی تشخیص ممکن ہے؟

---

[1] ''جموں میں اردو افسانہ......۱۹۴۷ کے بعد'' میں......شیرزاہ (گولڈن جبلی نمبر) صفحہ نمبر ۲۳۰، ۱۹۹۸

نیز یہ کہ نئی کہانی کی جمالیاتی حدود کیا ہیں؟......نئی کہانی زمان و مکان کے منطقی رشتوں کو لاشعوری طور پر بدل دینے پر قادر سہی لیکن زمین و آسمان کی وسعتوں میں اسے کہیں تو پیر ٹکانے ہی پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی لمحے میں تو سانس لینی ہی پڑتی ہے؟ کہانی کتنی ہی آفاقی اور باطنی ہو، کیا واضح یا پوشیدہ طور پر وہ ہمیشہ سماج اور معاشرے جڑی نہیں رہتی......"[1]

ابھی مابعد جدیدیت کا رجحان پروان ہی چڑھ رہا تھا کہ ۱۹۹۰ء کے بعد کشمیر کے حالات بدل گئے۔ ہر طرف گرینیڈ دھماکوں اور گولیوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ ان حالات میں گویا ہر شخص اپنے آپ سے جدا ہو گیا۔ غور و فکر کی صلاحیتیں معدوم، زبانیں مقفل اور قلم سیاہی کی لذت سے نا آشنا ہو گیا۔ تو اس کا شکار یہاں کے تخلیق کار بھی ہوئے۔ اس دور کی عکاسی عمر مجید کے ایک طویل خط سے ہوتی ہے۔ جس کا ملاحظہ کرنے کے بعد ساری صورت حال عیاں ہو جاتی ہے۔

ٹھیک دس سال بعد آپ کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں یا شاید دس جنموں کے بعد کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ یادوں کے الاؤ سے اٹھنے والا ملگجی دھواں، جہلم کے سینے پر دُھند کی دبیز تہہ، ڈل کے پیلے زرد آئینے، شالیمار کے زہریلے آبگینے، زبرون پہاڑی کے بھیانک سایے، ننگا پربت کی بے رحم سنگلاخ عمودی چٹانیں، گلمرگ کی اداس وادیاں، سونہ مرگ کی سیاہ کالی برف، جہنم کی آگ، دس برس، دس جنم، یہ دس جنم کیسے بیتے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ٹھیک دس برس پہلے میں دسویں جماعت کے طلبہ کو اقبالؔ کا تصورِ انسانیت پڑھا رہا تھا۔ مردِ مومن کے اوصافِ حمیدہ بیان کر رہا تھا، بچے انہماک سے سُن رہے تھے کہ اچانک لال چوک میں گھنٹہ گھر کے قریب ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پھر گولیوں کی گھن گرج میں سبق کو اُدھورا چھوڑ کر باہر آیا، سکول کا داخلی دروازہ بند کیا جا چُکا تھا۔

---

[1] بحوالہ "مقدمہ"......آزادی کے بعد اردو افسانہ، جلد اول، صفحہ نمبر ۱۸، سنہ اشاعت ۲۰۰۳

ایک زخمی شخص جس کے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا دروازے کے پاس لیٹا کراہ رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس ادھیڑ عمر کے زخمی شخص کو تقریباً گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ وہ زندہ تھا لیکن خون کی سُرخ لکیریں اس کی داڑھی کے بالوں کو رنگین کرتی جا رہی تھیں اور پھر...... اُس شخص نے میری گود میں دم توڑ دیا۔ میں اُسے پہچان چکا تھا۔ وہ عبدالخالق تھا، ہمارے محلے سونہ وار کا خالق حجام عبدالخالق...... ایکسی لنٹ، ہیر کٹنگ سیلون کا مالک۔ کسی کام سے لالچوک آیا ہوا تھا۔ طاقتور بم کا ایک بڑا سا ٹکڑا ٹھیک اس کے سر کے پیچھے لگا تھا۔ عبدالخالق نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو ایڑیاں رگڑتے ہوئے مرتے دیکھا تھا پھر پولیس آئی، لاش کو اُٹھا کر لے گئی اور میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتا رہا جو تازہ بہتے ہوئے خون میں نہا چکے تھے اُس رات میں بالکل نہ سو سکا اور دوسرے دن سکول بھی نہ جا سکا۔ خاموش پڑا عبدالخالق کے بارے میں سوچتا رہا کئی راتیں بیت گئیں کئی دن بیت گئے۔ میں اپنے آپ کو خالی خالی سا محسوس کرنے لگا۔ اسی حالت میں ایک ہفتہ گذر گیا فاطمہ پریشان، نوشابہ حیران یہ پاپا کو کیا ہو گیا؟ قلم، کتاب، نماز سب کچھ چھوٹ گیا اور پھر مجھے ایسا لگا میں بہت بیمار ہوں۔ مصیبت کی راتیں میرے لئے ٹھہرائی گئی ہیں۔ راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ میرا جسم کیڑوں اور مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھکنے لگا میرا دل جلا ہے کہ ڈھرکی سے بھی تیز رفتار اور بغیر اُمید کے گذرنے لگے۔ میری آنکھ خوشی کو نہ دیکھ سکی۔ روح کی تلخی، جان کا عذاب، مستقبل کا غم۔ میں زندہ تھا لیکن ایک بے گور کفن لاش کی طرح اور پھر یگ بیتے۔ الفاظ جن کے ساتھ میں کھیلا کرتا تھا اور جو میری لونڈی تھے میرے لئے اجنبی بن گئے۔ ایکسیلنٹ ہیر کٹنگ سیلون کا مالک عبدالخالق کو اس کے خون میں لت پت چہرے کو بھلا نہ سکا۔ وہ

بچپن میں میرے بال کاٹتا ہوا آیا تھا۔ پھر ایک دن جب اسے پتہ چلا کہ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ میں الٹی سیدھی کہانیاں بھی لکھتا ہوں تو اُس نے مجھ سے کہا میری بھی کہانی لکھئے میں تمہیں اپنی کہانی سناتا ہوں اور اُس نے مجھے اپنی کہانی سُنائی اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہر شخص اپنی ذات میں ایک افسانہ ہے۔ ناول ہے ایک پیچیدہ افسانہ، تہہ در تہہ، افسانہ در افسانہ، عبدالخالق ہر رات ساڑھے آٹھ بجے ریڈیو پاکستان سے خبریں سُنتا تھا کشمیر اس کی پہلی محبت تھی۔ میں اب بھی دَر دَر بھٹک رہا ہوں۔ اپنا خالی کشکول لئے کہ شاید کوئی میرا مسیحا بن کر میرے درد کو سمجھے۔ [1]

اس دور میں جن پنڈت افسانہ نگاروں نے ہجرت کا کرب جھیلا، انہوں نے بھی اس کی عکاسی افسانوں میں کی، جس کی وافر مثالیں دیپک بدکی، وریندر پٹواری، دیپک کنول، اشوک پٹوری کے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

چوتھا دور (۲۰۰۰ سے تا حال)

اکیسویں صدی کی ابتداء میں جن نئے اور تازہ دم افسانہ نگاروں نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اور جن سے مستقبل قریب میں بہت سی امیدی وابستہ ہیں ان میں منصور احمد منصور، مشتاق احمد وانی، زنفر کھوکھر، طالب کشمیری، نگہت نذر، پرویز مانوس، مجید ارجمند، مقبول ساحل، خالد کرار، وزیر محمد، نیلوفر ناز نحوی، ناصر ضمیر، ریاض توحیدی، فلک ریاض، ماسٹر غفار، یوسف میر، مشتاق کینی، میر ایوب میر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا افسانہ نگاروں میں بعض افسانہ نگاروں نے ۲۰۰۰ء سے قبل لکھنا شروع کیا ہے لیکن ان کے افسانوی مجموعے باضابطہ طور پر ۲۰۰۰ء کے بعد ہی منظر عام پر آئے ہیں۔

چوتھے دور کے افسانہ نگاروں کے شانہ بشانہ پیش رو افسانہ نگاروں نے بھی اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ اس کی عکاسی پیش رؤں کے نمائندہ افسانہ نگار نور شاہ یوں کرتے ہیں:

”روسی افسانہ نگار انتن چیخوف نے صحیح کہا ہے کہ تخلیق کار کے لئے مطالعہ ومشاہدہ آب حیات کی مانند ہے اور عمر جاوداں پانے کے

---

[1] بحوالہ ”عمر مجید کے بہترین افسانے..... مرتب سلیم سالک، صفحہ نمبر ۲۸، سنہ اشاعت ۲۰۰۹

لئے کچھ نہ کچھ تخلیق کرتے رہنا شرط اول ہے، شاید یہی اصول میرے رگ وریشے میں غیر دانستہ طور پر سرایت کر چکا تھا اور میں مسلسل لکھتا رہا، یہاں تک کہ میری ہم عمر نسل کے کچھ قلم کار تھک ہار کر بیٹھ گئے اور کچھ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی جگہ نئے تازہ لکھنے والے سامنے آ گئے اور اب طرح افسانوی منظر نامہ کبھی خالی نہیں رہا۔ اس نسل میں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ ہم لکھنے میں کسی سے کم نہیں۔ ان میں بشیر شاہ، شمس الدین شمیم، وریندر پٹواری، مشتاق مہدی، غلام نبی شاہد، آنند لہر، زاہد مختار، شیام طالب، دیپک بدکی، ظہور الدین، دیپک کنول، اشوک پٹواری اور ترنم ریاض (فہرست مکمل نہیں) قابل ذکر ہیں۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ نئی نسل کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑھ رہا ہے ایک طرف ان کو establishment کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف ایسے پلیٹ فارم بھی مہیا نہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جس سے یہاں اُردو افسانہ بھی متاثر ہوا۔ اس بارے میں نوجوان ادیب جنید جاذب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ریاست میں اردو افسانے کا زوال اصل میں سماج کی اردو زبان وادب کے تئیں بے رغبتی اور ادبی سرمائے سے عدم آگاہی اور دوری کا مظہر ہے ورنہ افسانہ، مختصر اور موثر ہونے کے باعث اس وقت باقی نثری اصناف کے مقابلے مقبول ترین اور موزون ترین صنف سخن ہے اور ریاست کسی طرح بھی اس رجحان سے مستثنیٰ نہیں۔ جو ادیب اور افسانہ نگار اس وقت ریاستی ادبی افق پر جلوہ نما ہیں بہت سوں بلکہ اکثر کا تعلق نوجوان نسل سے کہا جاسکتا ہے البتہ نئی پود (جو کہ سیاسی وسماجی عوامل کی وجہ سے غیر یقینی اور

---

[1]: ریاست میں افسانہ روبہ زوال کیوں؟...... روزنامہ "کشمیر عظمیٰ"، تاریخ اشاعت ۱۷ فروری ۲۰۰۸، بروز اتوار

فکری تنزل و انتشار کا شکار ہے) کی ادبی و تخلیقی صلاحیتوں کا دارومدار اسی امر پر ٹکا رہیگا کہ ان کے لئے ہم کس حد تک ادب نواز اور اردو دوست circumstances دستیاب کروا سکتے ہیں"۔[۲]

آج جب ہم ریاست میں اردو افسانہ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں ہمیں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں چاہئے وہ عالمی سطح کے گے کلچر ہو یا مصنوعی تولد اور کلوننگ، گلوبل ورمنگ کا مسئلہ ہو یا مصنوعی اعضاء کی پلانٹیشن، جنسی استحصال ہو یا مغرب کی اجارہ داری۔ ترقی پسندی سے ہوتے ہوئے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نظریات سے آنکھیں ملاتے ہوئے ہمارا افسانہ اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ خود اعتمادی سے کہیں بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔

سلیم سالک

۲: ریاست میں اردو افسانے کے مسائل...... ماہنامہ "لفظ لفظ" (خاص شمارہ) جنوری ۲۰۱۰، صفحہ نمبر ۳۱

پریم ناتھ پردیسی

ڈھول

پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے سے صُبح کا مُسکراتا ہوا سورج دو نیزے اُوپر آچکا تھا اور ابھی تک اُسے اپنے پپوٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔

اُس کے قدموں کے آگے، ڈل کے کُشادہ پاٹ سے پرے، بلیوارڈ کی حسین سڑک پر سبزی سے بھرے ہوئے چھکڑے شہر کی طرف دوڑ رہے تھے اور سڑک کے کنارے بنے ہوئے بنگلوں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر ٹٹو والے گھوڑوں کی باگیں تھامے انتظار کر رہے تھے۔

اُس نے مٹی کا گھڑا پانی میں ڈبویا اور خود بھی کسی خیال میں ڈوب گئی۔ اپنی چھٹتی ہوئی جوانی سے جو تڑپ، جو سوز، جو اضطراب وہ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر محسوس کیا کرتی تھی، آج اُس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ جیسے کارواں گذر چکا ہو اور شاہراہ پر صرف ڈھول رہ گئی ہو۔ اور سچ مچ یہ دھول اُسے ہر کہیں نظر آرہی تھی۔ اپنے بدن پر، اپنی آنکھوں میں ڈل کے ساکن جامد پانی پر، بلیوراڈ کے ہوٹلوں اور بنگلوں پر۔ اُڑتی ہوئی سی، چھائی ہوئی سی۔ اور وہ سوچ رہی تھی، اِتنی ڈھول آج اچانک آئی کہاں سے؟ لیکن نہیں، یہ صرف اُس کے ادراکی وجود کی یاسیت تھی جس نے اُس پر غلبہ پایا تھا۔ ورنہ اتوار کی صبح کو بلیوارڈ اور گگری بل کے نزدیک ڈھول کہاں؟ وہاں تو موت کو فریب دے کر آئی ہوئی زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کے متحرک سایے ہوتے ہیں اور سایوں کے قہقہے!

سڑک پر اب خاصی چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے ہندوستانی صاحب لوگ صبح کی سیر سے واپس آرہے تھے۔ ہاتھوں میں البم اور کیمرے لئے ہوئے عورتیں اور بچے۔ سب خوش وشادمان، شاید وہ شنکراچاری کی پہاڑی سے اُترے تھے۔ اُن کے چہرے سُندور کی طرح سُرخ تھے اور بدن تانبے کی طرح سخت۔ اُنہیں دیکھ کر اُسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ جب وہ ڈل کے پار بلیوارڈ کے اُس طرف اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ جھونپڑی اگرچہ چھوٹی تھی، مگر خوشیوں اور بےفکریوں سے بھری ہوئی۔ اُس وقت اُسے یہ

معلوم ہی نہ تھا کہ ڈل کا یہ نیلا پانی جس کا بہاؤ بہتے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتا، اُسے اس جھونپڑی سے کبھی جُدا کرے گا۔ اُن دنوں وہ ہر صبح اپنی سہیلیوں کے ساتھ ان پہاڑیوں پر چڑھتی اور سوکھی لکڑیوں کا ایک ٹوکرا بھر لاتی۔ جو اُس کے خیال کے مطابق بہت بڑی دولت تھی۔ لیکن اب ہر صبح کے ساتھ زندگی کے متحرک زاویئے بدل چکے تھے۔ عمودی زاویے ٹیڑھے ہو چکے تھے اور بچپن کی بہت بڑی دولت اب حقیر نظر آ رہی تھی بلکہ نفرت کی حد تک حقیر۔ عورت کے شباب کی دولت کچھ اور ہوتی۔ ایک بچہ جو اپنی کوکھ سے پیدا ہو اور زندگی کی لو کو جلائے رکھے۔ لیکن وہ...... وہ اس دولت سے ابھی محروم تھی اور خاوند کے آئے دن کے طعنوں سے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کی لو بجھا چاہتی ہے اور اُس کے آگے مہیب تاریکی چھا رہی ہے۔ مہیب اور لرزہ خیز!

آج بھی خاوند نے اسے طعنہ دیا تھا۔ ہر چند وہ گذشتہ ایک ماہ سے بیمار تھا، مگر اپنی منکوحہ کو طعنے دینے کے لئے مرد کے پاس ہمیشہ بے حد قوت ہوتی ہے۔ اُسے شاید اپنی زندگی کی لو بجھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جسے وہ دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس میں بیوی کا کیا قصور تھا؟ کیا اس نے ہر موقع پر اپنا جسم اس کے حوالے نہیں کیا تھا؟ اس کی [illegible] ہی کی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اُس کی بچپن کی سہیلیوں کے گھر لڑکیوں اور لڑکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ صرف وہ تھی جس کا گھر سُونا سُونا تھا۔ کیا ہر عورت کے بچہ ہونا ضروری ہے؟ کیا زندگی کی لو بچے کے بغیر نہیں رہ سکتی؟ شاید نہیں رہتی ہو۔ اس کی سہیلیوں اور گاؤں کی بوڑھیوں کا یہی خیال تھا۔ بچہ خاوند اور بیوی کے درمیان وہ رشتہ ہے جو ازل اور ابد کو ملاتا ہے اور یہ رشتہ دواؤں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بچھواڑے میں جو نرس رہتی ہے وہ یہ دوائیں بیچتی ہے۔ پانچ روپے میں ایک پُڑیا یا ایک بچہ۔ جو زندگی کی لو کو جلائے رکھنے کا ضامن ہے۔ مگر یہ پانچ روپے کہاں تھے؟ ایک بے چارے مزدور کی بیوی پانچ روپے پس انداز نہیں کر سکتی۔ اپنے مرد سے مانگ بھی نہیں سکتی۔ وہ ہمیشہ ایسے اخراجات پر قہقہے لگاتے ہیں۔ جو چیز آٹھ برس کی ازدواجی زندگی اور اس زندگی کی دعائیں حاصل نہ کر سکی وہ پانچ روپے کی دوا کب کر سکتی ہے؟ لیکن اُسے مردوں کے اس فلسفے میں اعتقاد نہیں۔ اس نے ہر بار بچھواڑے کی نرس کے گرد حاجت مند عورتوں کا ایک ہجوم دیکھا ہے اور پانچ روپے کی بے شمار پڑیاں۔!

اُس نے کئی بار پس انداز کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ اور جوں ہی تھیلی میں تین روپے سے زیادہ اکنّیاں اور دونّیاں جمع ہوتیں، یک لخت اُس کا خاوند بستر پر دراز ہو جاتا۔ دوا دارُو کے لئے تھیلی بھی خالی ہو جاتی اور میر بحری کے مشہور سُود خوار پنڈت سے بھی آٹھ دس رُوپے قرض پر لئے جاتے۔ ایسے موقعوں پر اُس نے کبھی تھیلی کو نہیں چھپایا۔ اور ہمیشہ اُس کا خاوند اکنیوں اور دونیوں سے بھری تھیلی دیکھ کر دل ہی دل میں اُس کی دور اندیشی اور پاک بازی کا معترف ہوتا۔ لیکن زبان پر کبھی بھی شُکریے کا ایک آدھ لفظ تک نہ آنے دیتا۔ حالانکہ اُسے اپنے خاوند کی ناشُکر گزاری کا کبھی احساس تک نہ تھا۔ جس کی دولت تھی اُسی کے کام آئی۔ پھر شُکر یہ کیا؟ اس بار بھی اُس نے چار سے زیادہ روپے جمع کئے تھے اور اب ہر لمحے اُسے زندگی کی لو کو حاصل کرنے کا یقین تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ مگر زندگی نے پھر پلٹا کھایا اور خاوند بیمار پڑا۔ بیماری کے شروع شروع میں وہ بیوی کا پس انداز دیکھ کر اپنا آپ دبا دبا سا محسوس کرتا۔ لیکن جوں ہی سود خوار کی باری آئی، احساس ختم ہو گیا۔ اور وہ طعنوں پر اُتر آیا۔ کاش میرا بھی بچہ ہوتا جو شام کو آٹھ آنے کے پیسے کما لاتا! لیکن تُم جیسی بانجھ عورتوں کے بچہ کہاں؟ خاوند کے اس زہریلے غصّے سے اُس کا لاشعور جھنجھنا اُٹھتا۔ جیسے کانچ کے ہزاروں برتن یک لخت گر گئے ہوں اور گرانے والا اپنی احتیاط پر حیران و پریشان ہو رہا ہو!

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پار سے ایک شکارا اُسے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس میں ملاح کے علاوہ دو آدمی تھے۔ ایک خوش پوش اور دوسرا عام نوکروں کی طرح اُجلا اُجلا لباس پہنے ہوئے۔ خوش پوش شاید مالک تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کیمرہ تھا اور نوکر کے ہاتھ میں ایک ڈبہ...... وہ انہیں دیکھ کر بالکل حیران نہ ہوئی۔ ہر ایت وار کو اس قسم کے خوش پوش انسان کئی شکاروں میں اُدھر سے گزرتے تھے اور گھاٹ پر کھیلتی ہوئی لڑکیوں کی تصاویر لیتے تھے یا پری محل کے اُداس اور اُجڑے مناظر کی۔ اور وہ انہیں تصویر لیتے وقت دل ہی دل میں ہنستی ان لڑکیوں میں کیا ہے؟ ننگی اور بھوکی لڑکیاں جن کی ساری تفریح گدلے پانی سے کھیلنا ہے۔ یہ تصویریں بھی ایسی ہی آتی ہونگی۔ میلی کچیلی، بدصورت اور ننگی۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جنت ارضی کی میلی مخلوق کی تصویریں جہنم کے بے فکر باسی بے حد پسند کرتے ہیں!

شکارا نزدیک آرہا تھا اور وہ اُن کی باتیں سن سکتی تھی "تصویر لینے دیگی"، نوکر پہلے

خاموش رہا۔ جیسے اپنے آپ سے فیصلہ کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ ''کیوں نہیں حضور۔'' وہ یہ سن کر چونک اُٹھی۔ کیا وہ اُس کی تصویر لیں گے؟ کیا اُنہوں نے بھی اُسے ایک میلی کچیلی اور آوارہ سی لڑکی سمجھ رکھا ہے جو شکارے میں بیٹھے ہوئے ہر صاحب لوگ کو زور زور سے چلا کر ''سلام صاحب'' کہتی ہے۔ وہ جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے گھڑے میں پانی بھرنے لگی اور نوکر نے شکارا نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''مہتہ بی!''

اُس نے گردن اُٹھا کر لاابالیانہ انداز میں شکارے کی طرف دیکھا اور جلد جلد نظریں جھکا لیں۔

نوکر نے مُسکرا کر کہا۔ صاحب تمہاری تصویر لینا چاہتے ہیں۔''

اُس نے خاموشی میں گھڑا اُٹھایا اور گھر کی طرف چل دی۔

مالک نے نوکر سے کہا۔ ''تم نرے گدھے ہو۔ اپنی ذات کی ایک معمولی عورت تک کو نہ پھانس سکے جس کی تصویر سے ہم ہزاروں کما سکتے۔''

''ہزاروں؟ نوکر حیران ہو کر دل ہی دل میں سوچتا رہا اور پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے جاتے دیکھنے لگا۔ واقعی وہ خوبصورت تھی اور ایسی عورتیں اُس نے میر بحری کے سارے علاقے میں نہ دیکھی تھیں۔

مالک نے کہا۔ ''دیکھتے کیا ہو؟ جاؤ پیسہ دکھاؤ۔''

نوکر چھلانگ لگا کر کنارے پر آ گیا اور اُس کے نزدیک پہنچ کر بولا۔ ''مہتہ بی صاحب تمہیں پانچ روپے دیگا۔''

پانچ روپے کا نام سن کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگوں میں سیسہ بھر دیا گیا ہو۔

پانچ روپے...... پانچ روپے۔

پچھواڑے کی نرس بھی پانچ روپے ہی مانگتی ہے۔

''بہ خدا ڈرو نہیں۔ صرف ایک منٹ لگے گا۔ اور پھر پانچ روپے۔''

اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ایک بچے اور اُس کے درمیان ہزاروں پردے حائل ہیں جو ایک ایک کر کے ہٹتے جا رہے ہیں اور بچہ بازو پھیلائے اُس کی طرف آ رہا ہے۔ نوکر نے پھر کہا۔ ''میں بھی تمہارا ہی مسلمان بھائی ہوں۔ اگر مالک کی جیب سے پانچ روپے تمہارے لئے نکلیں تو کیا ہوا۔ کم از کم آٹھ ترک شالی تو خرید سکوگی۔''

لیکن اُسے شالی کی ضرورت نہ تھی۔ اُسے پچھواڑے کی نرس کے لئے پانچ روپے چاہیں۔

وہ آہستہ آہستہ گھاٹ کی طرف آ گئی۔ کندھے سے گھڑا اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور خاموش کھڑی رہی۔

آیئے صاحب!" نوکر نے مالک سے کہا۔ مالک دل ہی دل میں خوش ہوا۔ لیکن اس کا اظہار کرنا اُس نے ضروری نہ سمجھا تا کہ عورت اور نوکر کو احساس نہ ہو کہ اُن دونوں نے اُس کے لئے کوئی بڑی قربانی دی ہے۔ اُس نے کیمرہ ٹھیک کیا۔ نوکر نے اُسے (pose) سمجھا دیا۔ دونوں ہاتھ آگے کو۔ بدن ڈھیلا ڈھیلا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں مصنوعی خمار۔ وہ پار بلیوارڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ سڑک پر گہما گہمی شروع ہو گئی تھی اور دُور کبوتر خان سے رنگ برنگی پردے لہراتی ہوئی ٹیکسیاں گھاٹوں کی طرف آ رہی تھیں۔

ایک...... دو...... تین...... اور تصویر لی گئی!

آتی بار جو دھول اُسے ہر چیز پر چھائی ہوئی سی نظر آ گئی تھی، واپسی پر وہ کہیں نہ تھی۔ پری محل کے اُوپر مُسکراتے ہوئے سُورج کی کرنیں ہر چیز پر لوٹ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ بنگلے، ہوٹل، ڈل، گاؤں سب ان قہقہوں سے دوہرے ہو رہے تھے۔ اُس کے پپوٹوں میں بھی اب نمی نہ تھی، اس کے برعکس اُسے اپنے آپ میں ایک لطیف قہقہے کی لذّت محسوس ہو رہی تھی جو گدگداہٹ سے اُبھرتا ہے اور روکنے کے باوجود اُبھرتا ہی رہتا ہے۔ اچھا ہوا، آج تک اُسے بچہ نہیں ہوا۔ ورنہ سیاہ پیرہن کے تلے کچے انار کی طرح یہ سخت چھاتیاں کہاں ہوتیں۔ گورے چہرے کا تناؤ اور بازوؤں کا تناؤ کہاں ہوتا؟ وہ اُس ناشپاتی کی طرح دکھائی دیتی جس کا رس نچوڑا گیا ہو۔ گوشت اور پوشت کے نیچے صرف ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا۔ اور زندگی کسی مفلس کی شرمیلی مسکراہٹ کی طرح نظر آتی۔

گھر پہنچ کر اُس نے خاوند سے کچھ بھی نہ کہا۔ ممکن ہے وہ اس حرکت کو ناپسند کرے۔ لیکن خاوند چُپ نہ رہ سکا۔ بولا۔۔۔ "دیر کیوں ہو گئی؟"

"یوں ہی!" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا اور کندھے سے گھڑا اُتار کر رکھ دیا۔ اُس کے خاوند کو اس جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ یوں ہی دیر کیسے ہوتی ہے! وہ سوچنے لگا۔ بڑی دیر تک وہ اسی تذبذب میں بھٹکا رہا۔ پھر بولا۔۔ "یونہی کیسے؟" بیوی نے دوبارہ بے

پروائی سے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ ایک صاحب تصویر لے رہے تھے۔''

''کس کی؟''

بیوی شاید اس سوال کی متوقع نہ تھی۔ وہ اندر ہی اندر لرزنے لگی اور اُس کا خاوند بڑی بے تابی سے جواب کا مُنتظر رہا۔ بالآخر اُس نے مٹی کی خالی ہانڈی کو بالکل غیر ارادی طور پر ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک عورت کی!''

اُس کا خاوند چونک اُٹھا۔ جیسے جھونپڑی کی چھت اُس کے سر پر آ گری ہو۔ ''عورت کی؟ کون تھی وہ؟''

''مجھے کیا معلوم۔۔۔؟ اُس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے اُسے خُود اُس عورت سے نفرت ہو۔۔

''اور تُو تماشہ دیکھتی رہی۔۔'' اس بار اُس کے الفاظ میں طنز تھی۔ وہ اس سوال پر حیران رہ گئی۔ اُس نے اندر ہی اندر پیرہن کی جیب میں پڑے ہوئے نوٹ کو چھوا اور ہلکا سا اطمینان محسوس کیا۔ خاوند نے اپنی طنز نا کافی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کل کی عورتوں کا کیا ہے، جسم بھی کوئی کہے وہ بھی پیش کریں گی۔''

اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اُسے اپنے پاؤں تلے کی زمین سرکتی ہوئی سی دکھائی دی۔ وہ اضطراب میں بار بار مٹی کی ہانڈی کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتی گئی۔ جیسے سارے کمرے میں اُس ہانڈی کو رکھنے کے لئے کہیں موزوں جگہ نہ ملتی تھی، جہاں وہ سہارے کے بغیر رہ سکے۔ اُس نے اس دوران میں ایک بار بھی بستر پر پڑے خاوند کی طرف نہ دیکھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی پیشانی پر گھاٹ کی ساری کہانی لکھی جا چکی ہے اور وہ اُسے ایک ہی نظر سے پڑھ ڈالے گا۔

سودخوار پنڈت نے کل ہی سات روپے دیئے تھے۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ یہ پانچ روپے اُسی کو دوں گی۔ بوجھ تو ہلکا ہوگا۔ لیکن فوراً اُسے خاوند کا خیال آیا۔ شاید پوچھ بیٹھے یہ پانچ روپے کہاں سے آئے، جب وہ خالی تھیلی آج سے دس دن پہلے دیکھ چُکا تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ بالآخر خاوند کو کھانا کھلا کر وہ فیصلہ کئے بغیر ہی نرس کے پاس چلی گئی۔ اور جب واپس آ گئی تو وہ بے حد خوش تھی۔ خاوند کے طعنوں کے تمام نقوش لاشعور سے مٹ

گئے تھے۔ نرس نے اُسے دوا دی تھی اور بچے کا یقین دلایا تھا۔ اُس رات اُس کا بیمار خاوند اُس کی عجیب وغریب حرکتوں پر حیران رہا۔ ''یہ کیا بچپنا ہے؟'' اُس نے کئی بار پُوچھا اور وہ ہر بار مسکراتی رہی۔ اور دوسرے دن صبح اُسے سچ مچ اپنے پیٹ میں ایک زندہ بچے کا احساس ہوا۔ زندہ بچہ جو اُس کی زندگی کی لوکو بجھنے نہیں دے گا۔ جو ازل اور ابد کو ملائے گا۔ دوشیزگی سے کل رات تک جو تشنگی سی اُسے ہر وقت محسوس ہوتی تھی وہ آج بجھ گئی تھی۔ وہ اُداسی اور تفکر، جو ہر صبح پڑوس کے بچوں کو روتے ہنستے دیکھ کر اُس کے اندر ہی اندر ذہن کا احاطہ کئے رہتی تھی، اب مٹ چکی تھی۔ ایک موہوم سی اُمید نے اُس کی زندگی کے تاروں کو ملا کر اُن سے ہم آہنگ آواز پیدا کر دی تھی۔ اگرچہ وہ آواز ابھی اس قدر مدھم تھی کہ اُس کا بیمار شوہر نہ سن سکتا تھا۔ مگر وہ سن سکتی تھی۔ تاروں کا ارتعاش اور ارتعاش کی جھنجھناہٹ تک کو محسوس کرتی تھی۔ یہی ارتعاش اُس کی آرزو تھی جسے محسوس کرنے کے لئے وہ آٹھ سال سے بے تاب تھی۔ اب اسے سنبھالنے کے لئے بلند حوصلگی کی ضرورت تھی، ضبط کی ضرورت تھی۔ کاش اُس نے کچھ عرصہ پیشتر یہ اقدام کیا ہوتا! لیکن کیمرے لئے ہوئے سیاح صرف ننگی اور بھوکی لڑکیوں کی تصویریں لیتے تھے۔ اور وہ بھی بلا کسی معاوضے کے نہ لڑکیاں اس کے لئے احتجاج کرتی ہیں نہ تصویر کھینچنے والے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پری محل کے اُجاڑ کھنڈر بلیوارڈ سے پرے سب کچھ دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ کل بھی ان کھنڈروں نے اُسے فوٹوگرافر کے سامنے کھڑا دیکھا اور نوٹ بھی دیا تھا۔ اور آج صبح وہ اُسے پھر دیکھ رہے ہیں جب وہ ایک محسوس بشاشت سے پھٹی پڑی ہوئی ہے۔ اور سب کو راز کی بات کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

کچھ دنوں بعد اُس کا خاوند ٹھیک ہو گیا۔ اور پھر وہی طعنے شروع ہو گئے اس سے پہلے یہ طعنے سُن کر اُس کا دل ملول ہو جاتا تھا اور اکثر آنکھوں میں آنسو پھوٹتے تھے۔ لیکن اب یہی طعنے اُسے میٹھے سے لگنے لگے۔ اور وہ اُنہیں سُن کر ہر بار مسکرا دیتی۔ جیسے کہتی ہو۔ ''ان کی عمر زیادہ نہیں۔ یہ بوڑھے ہو گئے ہیں اور جلد ہی مر جائیں گے۔ چند ہی مہینوں کی بات تو ہے جب یہی طعنے لوریوں میں تبدیل ہوں گے۔ وہ آج ہی سے ان کا اندازہ بھی لگا سکتی تھی۔ خاوند سر جھکائے ہوئے ہے۔ اُس کے چہرے پر شرمندگیاں ہیں اور اُس کے ذہن کو ان کی تلافی کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ وہ عالی ظرف عورت کی طرح اب بھی

مسکرا رہی ہے۔ چبھتے ہوئے گذشتہ طعنوں کو بھُلا رہی ہے بلکہ بھول چکی ہے۔لیکن اُس کا خاوند ندامت میں غرق ہے اور بچہ ہنڈولے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔شاید کہہ رہا ہے ۔میں بھی ڈل کے نیلے پانی میں کھیلوں گا۔میلی کچیلی اور بدصورت آوارہ لڑکیوں کے ساتھ سارا سارا دن گھاٹ پر بیٹھا کروں گا اور سیاح میری تصویریں لیا کریں گے۔مگر وہ اُسے گھاٹ پر نہیں جانے دیگی۔ چہ جائیکہ پری محل کے اُجاڑ کھنڈر سب کچھ جانتے ہیں اور ہمیشہ سب کچھ جانتے رہیں گے۔

چار مہینے گذر چکے تھے۔

ایک شام اُس کا خاوند مزدوری سے واپس آیا اور اسے بلا کر پوچھا۔"تم اُس عورت کو جانتی ہو جس کی تصویر کسی صاحب نے لی تھی؟"

وہ اندر ہی اندر سے کانپنے لگی۔سر سے اشارہ کر کے بولی۔"نہیں!"

خاوند نے مسکرا کر دوبارہ پوچھا۔"جانتی ہوگی؟"

"کس عورت کو؟"

اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔"ہر روز ہی تو صاحب تصویریں لیتے ہیں"۔

خاوند نے اُسی انداز میں کہا۔"تمھیں نہیں یاد۔آج کوئی چار مہینے گذرے جب تم ہی نے کہا تھا کہ کسی صاحب نے عورت کی تصویر لی۔"

اب کی بار اُس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔پری محل کی مہیب پہاڑیوں کی غیر جذباتی چوٹیاں اُسے زمین پر گرتی ہوئی نظر آئیں اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں کیچڑ میں لت پت دکھائی دیں۔کیا پری محل کے کھنڈروں نے اُس کا راز افشا کر دیا تھا؟

وہ خاموش مگر حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جس کے چہرے کی مصنوعی مسکرہٹ آہستہ آہستہ غصے میں بدل رہی تھی۔"تو تم نہیں جانتی اُسے؟" اُس نے ایسے انداز میں کہا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔اور اب اُس کے مُنہ سے ہاں سننے کا منتظر ہے۔اُس نے بھی اپنے دل میں سب کچھ کہہ ڈالنے کا قصد کیا۔لیکن الفاظ کی قطار آتے آتے اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔صرف ایک ارتعاش پھیل گیا جسے اس کا خاوند نہ سمجھ سکا۔

یکا یک اُس کے خاوند نے اندر کی جیب سے تصویر نکالی اور اُسے دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہی ہے نا وہ۔جسے تم شاید اب بھی نہیں جانتی۔؟"

تصویر دیکھتے ہی اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش پر پڑی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگی۔ سیاہ پیرہن میں لپٹا ہوا گورا گورا بدن، چہرے پر شہد آمیز مسکراہٹ جیسے بادام کے پھول دونوں ہاتھ آگے کو جیسے کنول کے دو پھول جڑے ہوئے۔ وہ ایک نظر سے تصویر دیکھتی رہی اور دوسری نظر سے خاوند کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ۔ اُسے فوراً ہی محسوس ہوا جیسے تصویر میں پیرہن کے باوجود بھی وہ سر سے پاؤں تک ننگی ہے۔ اُس کی کچی انار جیسی چھاتیاں ننگی ہیں۔ پُر گداز بازو ننگے ہیں اور اُس کے سارے بدن پر بلیوارڈ کی دھول اُڑ رہی ہے۔ خاوند نے زہریلے ہوئے لفظوں میں کہا۔ ''دیکھتی ہو۔ اب تو اسے پہچانتی ہوگی۔ سُنا ہے بازار میں خوب بک رہی ہے۔ لوگ اسے ولایت تک لے رہے ہیں۔ کتابوں میں چھاپ رہے ہیں۔ اخباروں میں نکال رہے ہیں اور کشمیر کی عورتیں اسے دیکھ کر پانی پانی ہو رہی ہیں تم نے تصویر کیا کھچوائی اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت بیچ ڈالی۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنسو جو طعنے سُن سُن کر بھی اتنے تلخ نہ ہوتے تھے۔ آج کے آنسوؤں میں دھوئیں کی سی کڑواہٹ تھی۔ تیزاب کی سی جلن اور زہر کی سی تلخی۔ خاوند اُس کے آنسو دیکھ کر بھڑک اُٹھا۔ بولا۔ ''اب روتی کیا ہو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اُس صاحب نے تمہاری تصویر ہی نہ لی بلکہ تمہاری عصمت پر بھی تھوکا۔ تمہارے خاندان پر تُھوکا۔ تمہاری نسائیت اور تمہاری زندگی پر تھوکا اور یہ تھوک ایسی ہے جو زندگی بھر تمہارے بدن سے الگ نہ ہوگی۔ اب جو چاہو، کرو۔ کیا تعجب ہے جو کچھ تمہارے پیٹ میں ہے وہ بھی کسی صاحب کا...'' اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھوں کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں اور کچے انار جیسی چھاتیاں پھڑکنے لگیں۔ اُس کے دماغ میں ایسی حالت پیدا ہوگئی جیسے بارود کا بہت بڑا ڈھیر یک لخت چنگاری لگنے سے پھٹ گیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑی۔ جب اُسے ہوش آیا۔ رات آدھی اُدھر تھی آدھی ادھر۔ کمرے میں تاریکی اور خاموشی باہوں میں باہیں ڈالے اُونگھ رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی۔ آخر میں نے کیا کیا؟ کیا کیا؟ کیا مرد اپنی تصویریں نہیں کھچواتے؟

اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اُبھرے ہوئے پیٹ پر پھیرا۔ اُسے شدت سے محسوس ہوا جیسے اُس کے پیٹ میں وہ بچہ نہیں جو اُس کی زندگی کی لو کو جلائے رکھے گا بلکہ دھول ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کے مستقبل پر چھائی رہے گی۔ ☆☆☆

کاغذ کا واسدیو

جب دھوئیں کی لپیٹ میں مرگھٹ کے دیودار بھی آگئے، واسدیو سے کہا گیا کہ چتا کو نمسکار کرے اور گھر کی طرف چلے۔ اس وقت واسدیو کے ہاتھ پاؤں اوروں کے اشاروں پر ہی چلتے تھے۔ خود تو وہ کہیں اور تھا، ہاتھ پاؤں سے دور' ایک ایسی دنیا میں جہاں بنیادیں ہل رہی تھیں' جہاں گھاٹیاں ہی گھاٹیاں تھیں۔ جہاں کروڑوں واسدیو گم ہو جائیں تو ان کا پتہ بھی نہ چلے۔ ایک دیوکی کے اُٹھ جانے سے اردگرد کے پہاڑ بھی گویا کھوکھلے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن واسدیو ابھی گم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کی آواز ارتھی کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی سن لی تھی۔ ان کو جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے آتے دیکھا تھا اور پھر جب ارتھی نالے تک آگئی، اس نے دل میں فیصلہ بھی کیا تھا کہ بچے مرگھٹ تک نہیں جائیں گے' یہ وہ نہیں دیکھیں گے کہ ماں ان شعلوں میں گم ہوگئی' اور باپ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور جب ارتھی نالے کے پار آگئی تھی۔ اس نے نالے پر سے تختہ بھی اٹھا دیا تھا کہ اگر وہ دونوں نالے تک آ بھی گئے پھر بھی اُسی پار رہیں گے۔ واسدیو ان گھاٹیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اور بچ بچ کر ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس نے نمسکار کیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ڈھال پر اترتے ہوئے اس کے پیر ڈگمگائے شاید اسلئے کہ اس کے سینے میں پہاڑ گھسنے لگے تھے۔ یا اس لئے کہ وہاں سے دھان کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ جن کے کنارے کاٹتا ہوا وہ نالہ گرتا، لپکتا اور بل کھاتا اسی کے بچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس پار اس کے بچے بھی شاید اسی دھوئیں کو دیکھ رہے تھے جو اب دیوداروں سے بھی اوپر چلا گیا تھا۔ کتنی پاس تھی وہ گھاٹیاں کتنی گہری، یہ دھواں بھی اُسی کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔ لیکن اس نے قدم سنبھالے، آنکھیں کھولیں اور نالے کی اترائیوں کو دیکھ کر ان اونچائیوں کی طرف بھی نظریں اٹھائی۔ جہاں سے یہ پانی مچلتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اس نے اپنے کان بھی کھولے۔ پانی پتھر پہ گر کے ٹوٹ رہا تھا، لیکن ٹکراؤ میں اس نے ہنسیاں سنی۔ ٹوٹے ہوئے پانی کو

لہروں میں جاتے دیکھا، آگے بڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اس کے پاؤں میں قوت سی آ گئی اور وہ بچوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا گیا۔

نالے پر تلسی اور موہن اس کے دو بچے سسکیاں بھر رہے تھے گھاٹیاں کیا وہاں خود واسدیو کا سینہ کھلنے لگا تھا۔ اندر اندر پہاڑوں کا بوجھ بھی پگھلنے لگا تھا۔ اس نے وہاں بھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ پہاڑوں کو تو پگھلنے دیا اور نالہ جو سامنے تھا اسی کے قہقہے اٹھا لیے اور اتنے زور سے ہنسا کہ خود نالے کی آواز تک نہ سنائی دی۔ اتنے قہقہے، اتنے قہقہے، جیسے وہ ہنستا ہوا نالہ اسی کے سینے سے نکلنے لگا۔

پھر بات بات پر واسدیو کے قہقہے گونجنے لگے۔ بات بات ہنسی کی لہروں میں سموئی ہوئی نکلی۔ اُس کے قہقہوں سے وادی بھر گئی۔ گھاٹیاں بھر گئیں، پہاڑوں سے بھی قہقہوں کے جواب آنے لگے۔ کائنات ہنسنے لگی۔ بچے بھی ہنسنے لگے، اتنا کہ اُن کو مُردوں تو کیا، زندوں تک کے نام لینے کی فرصت نہ ملی۔ دن بھر ہنستے ہنستے انہیں رات کو ہنسی کے سپنے آنے لگے۔ واسدیو اور وہ دو کاغذ، کمانی اور ڈور کی طرح ایک رنگیلے پتنگ میں جڑ گئے اور قہقہوں میں لہرانے لگے۔

وہ تینوں ہر وقت جڑے رہتے تھے۔ رات کو خاندانی لحاف میں، دن کو رسوئی میں، آنگن میں، کوٹھار میں یا دھان کے کھیتوں میں۔ لیکن جہاں بھی ہوتے کھیلتے۔ واسدیو سیدھی بات کرتے ہوئے ناک کو کچھ ایسا سکیڑتا، ہونٹوں کو کچھ ایسے ہلاتا، منہ پر ایسے زاویئے بناتا کہ تلسی اور موہن لہروں میں ہی رہتے۔ ہنستے ہی رہتے۔ نت نئی بات ہوتی، نئی بات پر نئے قہقہے نکلتے اور واسدیو تماشے پر تماشہ کرتا جاتا۔ کچھ اور نہیں تو بیٹھے بیٹھے پگڑی سَر سے اتارتا، اسی کو طرح طرح سے باندھنے لگتا، پھیلی ہوئی چڑھتی ہوئی، بڑی ٹوکری سی جیسے نمبردار باندھتا تھا۔ گھٹی گھٹی، گول گول شنکھ سی، جیسے پنڈت جی باندھتے تھے۔ بٹی ہوئی رسی جیسے تہوں والی، پھٹکارتی ہوئی جیسے چوکیدار باندھتا تھا۔ وہ سہجا کی نقل کرتا جو ساہوکار کے سامنے تتلاتا تھا۔ اسی طرح کی پگڑی ماتھے تک لاتا، ہاتھ میں ساہوکار کی طرح نسوار دانی کو لیتا، پھر ساہوکار کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اسے گالیاں دیتا۔ دوطرفہ کھیل میں واسدیو کی ایک آنکھ سہجا کی سی پھٹی پھٹی ہو جاتی اور دوسری ساہوکار کی طرح تیز تیز چلتی۔ کبھی تو وہ بھٹے کی ڈاڑھی منہ پہ لگاتا۔ ٹوٹی ہوئی عینک ناک کی نوک پر رکھتا اور سر نیچے اور آنکھیں اوپر حسن

حکیم کی طرح نبض دیکھنے لگتا۔ ہر مرض کی وہ ایک پڑیا باندھتا، اور جیسے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں سے منقیٰ، سپستان، بادیان، منقیٰ، سپستان، بادیان، کی رٹ لگاتا۔ تلسی کہتی ''حکیم چاپ میلی آنکھ میں دلد ہے'' وہ پڑیا اُٹھتا اور کہتا۔ ''منقیٰ سپستان، بادیان'' موہن کہتا ''تتیم تاب مولے پیل میں دلد ہے۔'' وہ وہی پڑیا اٹھاتا۔ ''منقیٰ، سپستان، بادیان'' احمد چرسی سے لے کر پنڈت جی تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی اس نے نقل نہ اتاری ہو، تلسی موہن کو ہنسانے کے لئے پتنگ کو ہوا میں رکھنے کے لئے۔

واسدیو کو بھی زندگی بسر کرنی تھی، صبح شام کی جدوجہد اسے بھی کرنی تھی، وہ بھی پسینے بہاتا رہا۔ جینے کی محنتیں بچوں سے بھی کرواتا، لیکن ایسے جیسے وہ تینوں ہر دم کھیل کے میدان میں تھے۔ کھیت سے گزرتے وہ گیڈروں کی آوازیں نکالتے، پہاڑ پر چڑھتے تو رام، لکشمن، ہنومان کا کھیل کھیلتے۔ وہ دو واسدیو کے کندھوں پر سوار، واسدیو ہنومان کا منھ بنائے، ہنستے کھیلتے۔ کٹھن منزلوں کو طے کرتے تھے۔ وہ ٹھنڈے پانیوں میں نہاتے، بطخوں کی طرح ڈبکیاں مارتے، پانی کی چٹکیوں پر بھی نہ روتے، بطخوں ہی طرح ''کوئے کوئے'' کرتے، تالیاں بجاتے، غل مچاتے اور تلخیوں کو پاس بھی نہ آنے دیتے۔

ہنسنے ہنسانے کے علاوہ واسدیوان کے لئے کھلونے بھی بناتا تھا۔ شہر اس گاؤں سے بہت دور تھا، جس کے راستے میں بہت سی پہاڑیاں تھی۔ اتنی دور واسدیو کھلونے لینے کیسے جاتا؟ جاتا بھی تو شہری کھلونوں کے دام کہاں سے لاتا؟ وہ اپنے کھلونے آپ بناتا۔ نئے کھلونے جن میں جان ہوتی تھی، جن کا بچوں سے زیادہ رشتہ ہو جاتا بہ نسبت ان شہری کھلونوں کے جن کے دام بھی زیادہ ہوتے تھے۔ وہ چشمے پر لٹکتے ہوئے سیبوں پر چونا پوتا اور دن میں ہی چند تاروں کو چشمے میں تھرتھراتے دکھاتا۔ اخروٹ کے خول میں چاول کے چار دانے ڈالتا۔ اس کے اوپر کاغذ چپکاتا، گھوڑے کے ایک بال کے ساتھ ذرا سی تیلی باندھ کر بال کو کاغذ میں پھنسا دیتا۔ بال کے دوسرے سرے کو ایک داتن کے ساتھ باندھتا اور داتن کو گھماتا۔ اخروٹ بولنے لگتا اور بچے گری کھا کر اخروٹ کا گانا بھی سن لیتے۔ وہ سیبوں، ناشپاتیوں کو کھوکھلا کر کے، بید کی سینخوں کو ٹیڑھا کر کے، گول گول کنکریوں کو ترتیب میں بٹھا کے بید مشک کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر من بھائے باغ لگا کے کھلونوں کی ایک انوکھی دنیا میں رہتے تھے۔

اس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اسے ان بچوں میں خوشی ہی کا نہیں بلکہ خوش قسمتی کا بھی احساس پیدا کرنا ہے اور جب وہ کبھی کسی دوسرے کو ان کے مقابلے پر اترتے دیکھتا۔ اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، وہ زمین کھودتا، پہاڑ پر چڑھتا، تلسی موہن کی وہ چیز پیدا کرتا کہ ان کا سر نمبردار کے لڑکے سے بھی اونچا رہے۔

نمبردار کا بھائی شہر میں کسی افسر کے ہاں نوکر تھا۔ بھتیجے کے لئے وہ ایک ولایتی گڑیا لے آیا۔ اُسی دم نمبردار کا بیٹا گڑیا نچاتا، اودھم مچاتا مغرور تلسی کو دکھانے آیا۔ تلسی اور موہن اس لمحے واسدیو کے پاس تھے۔ وہ وہی آنگن میں کھڑا تھا۔ آنگن کی برف کو بیلچوں سے کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار سے باہر پھینکتا جا رہا تھا۔ اس نے بھی وہیں سے گڑیا دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ تلسی کے چہرے پر ایک سایہ دیکھتا، اس نے ایک نعرہ بلند کیا جیسے وہ اس وقت کیا کرتا تھا جب کام کرتے کرتے اسے کوئی نیا کھیل سوجھتا۔ تلسی اور موہن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے گڑیا والے کو وہیں چھوڑ کر برف پر لڑھکتے پھسلتے باپ کی طرف دوڑے چلے گئے۔ واسدیو نے دونوں کو اٹھا کر پیار کیا۔ ان کو مکان کے برآمدے میں بٹھا کر ایک کمبل سے لپیٹا۔ تلسی نے گڑیا والے کو بھی کمبل میں جگہ دی اور آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ دیکھ میرا باپ کیا تماشا کرتا ہے اور جب واسدیو بھالو کی طرح چلنے لگا، جن پریوں کی طرح اچھلنے لگا۔ بیلچہ جادوگر کی طرح چلانے لگا اور برف کو کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار کے اندر ہی ایک ڈھیر میں چڑھاتا گیا۔ گڑیا والے کی گڑیا بھی کمبل میں گھس گئی اور دھیرے دھیرے اس کے نیچے دب گئی ذرا سی دیر میں آنگن بھی صاف تھا اور بچے برف کے ایک چھ فٹ لمبے تمام گڈوں کے باپ سے باتیں کر رہے تھے جس کی بھنویں اور جس کے بال گھوڑے کی دم کے تھے، منہ تھا اور مونچھیں تھیں۔

گاؤں کے بہت سے بوڑھوں نے بھی شہر کو نہیں دیکھا تھا، بچے کیا دیکھتے۔ لیکن نمبردار کا بھائی اپنے بھتیجے کو شہر لے گیا اور واسدیو کو ایک بھاری خطرے کا اندیشہ ہوا کہ نمبردار کا بیٹا آکے شہر کی باتیں کریگا، تلسی موہن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور یہ موقع وہ تھا کہ گہرے سوچ کی ضرورت تھی۔ وہ گاؤں کی حد پر اُسی پہاڑی نالے پر سوچنے بیٹھا اور جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا وہ اسی نالے کو گہری نظر سے دیکھنے لگا جو تلسی، موہن اور واسدیو کی طرح اُچھلتا، کھیلتا اور دوڑتا تھا۔ تلسی نے اسکے قہقہے بھی سنے تھے۔ اس نے واسدیو سے کئی بار

پوچھا تھا، کہ نالے کو کون ہنساتا ہے۔ واسدیو نے ہر بار اس سے کہا تھا کہ نالے کا بھی ایک باپ ہے۔ بہت دور، پہاڑوں کے اوپر، آسمان کے پاس۔ یہ نالہ اُسی کی گود میں سے نکل چلا آتا ہے، باپ اُسے اتنا ہنسا کے بھیجتا ہے کہ وہ ہنستا ہی چلا جاتا ہے اور جب تلسی نے یہ بھی پوچھا تھا کہ جاتا کہاں ہے۔ اُسے سمندر کا بھی خیال آیا تھا۔ لیکن سمندر کے تصوّر سے واسدیو کانپ اٹھا تھا، اس کے جمود اور خاموشی میں ہنسی نہیں تھی، نالہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ نالہ ہنستا ہی جاتا ہے۔ کہیں بھی نہیں رکتا، رکے ہوئے پانی کا نام نالہ نہیں ہوتا۔

وہ نیلا چشمہ جس کی باتیں چرواہے کرتے تھے جہاں سے وہ نالہ نکلتا تھا۔ ڈیڑھ دن کی کٹھن چڑھائیوں کے اوپر تھا۔ جانے والے کو رات کھلے پہاڑ پر بسر کرنا پڑتی تھی۔ لیکن واسدیو نے عزم اور انتظام کر لیا۔ دو دن کی روٹیاں باندھیں اور دو لوئیاں اٹھائی اور تلسی موہن اس سے پہلے کہ نمبردار کا بیٹا شہر سے آتا رام، لکھشمن ہنومان کا کھیل کھیلتے' ہری ہری ان دیکھی وادیوں میں سے گزرتے، پہاڑ کی دھوپ ہواؤں میں' پہاڑوں سے اوپر' آسمان کے پاس' وہاں' جہاں نہ نمبردار کا بیٹا، پہنچ سکتا تھا، نہ تحصیلدار کا' خود نالے کے باپ تک آ گئے۔

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیاں بجھ گئیں، جب اس نے تلسی سے یہ سنا کہ اس نے اور موہن نے بھی نالے کے باپ کو تین پہاڑ اوپر ایک رنگے ہوئے چشمے میں دیکھا تھا۔ چشمے میں برف کے بڑے بڑے لٹھے تیرتے ہوئے دیکھے تھے جو حقیقت میں نیلے میاں کے بازو تھے۔ یہ کہ ابا نیلا تھا لیکن بیٹا نکلتے ہی بے رنگ پانی جیسے دکھائی دیتا تھا۔ مگر باپ کی گودی سے نکلتے ہی ہنسنے لگا تھا۔ انہوں نے وہ گدگدی بھی دیکھی تھی جو باپ اُسے کرتا تھا اور یہ کہ گاؤں سے لے کر چشمے تک انہوں نے نالے کے انگنت کھیل دیکھے تھے۔ کہیں سانپ کی طرح رینگتا تھا، کہیں شیر کی طرح جھپٹتا تھا کہیں چکی چلاتا تھا کہیں فوارہ۔ اس کے کنارے پتھر پہ انہوں نے مخمل بچھی دیکھی تھی۔ ہری بھی اور لال بھی۔ یہ کہ راستے میں پریوں کے باغ تھے، جن میں وہ پھول تھے کہ کوئی زمین پر کیا اگا سکے۔ تلسی نے گھر کی گیتا کو کھولا اور نمبردار کے بیٹے نے ہر ورق میں دبا ہوا، سوکھا ہوا نیا پھول دیکھا۔ یہ پھول نہ گاؤں میں تھے نہ شہر میں، افسر کے باغ میں بھی نہ تھے، تلسی نے اسے یہ بھی کہا کہ اس نے راستے میں دھوپ اور ہوا کا بیاہ دیکھا۔ جب وہ دن بھر دھوپ اور ہوا میں رہے تھے اور انہیں نہ دھوپ لگی تھی نہ ہوا، دھوپ اور ہوا وہاں اتنی گھلی ملی تھی۔ تلسی اور موہن

بادلوں سے بھی اوپر گئے تھے۔ ایک بار جب نیلے میاں کے اوپر نیلا آسمان تھا اور دھوپ تھی۔ کہیں بہت نیچے بادل آگئے تھے اور دھان کے ننھے ننھے کھیت غائب ہو گئے تھے۔ اس وقت کسی پری نے ان کی خاطر بادلوں میں ایک بڑا سوراخ کر دیا تھا، ایک کھڑکی سی کھل گئی تھی۔ جس میں سے انہیں پھر سونے کے کھیت دکھائی دیئے تھے۔ وہ ایک جادو تھا، جب اوپر دھوپ تھی، نیچے دھوپ تھی اور بیچ میں بادل تھے۔ نمبردار کے بیٹے نے جا کر اپنے باپ سے کہا کہ تلسی، موہن اور واسد یو تینوں پریوں کے رشتہ دار ہیں اور باپ کی ایک بھی نہ سنی، جب اس نے یہ سمجھانا چاہا کہ وہ اس کے ماتحت انسان ہیں۔

اور واسدیو کھلونے بناتا گیا، تماشے کرتا گیا اور بچوں کو ہنساتا گیا۔ کبھی کبھی وہ تھک بھی جاتے اور اس کی طرف پیٹھ کر کے اپنے کھلونوں میں محو ہو جاتے گو ایسے لمحے بہت کم ہوتے جب واسدیو انہیں کھلونوں میں ہی محو ہونے دیتا۔ جب گھاٹیاں کھلنے لگتی۔ اندر اندر نالہ بھی ڈوبنے لگتا، پتنگ کی ڈور کمانی ڈھیلی پڑتی اور کاغذ کا واسدیو گر پڑتا۔ ایسے لمحوں کو وہ آنے ہی نہ دیتا۔

ہنستے ہنساتے گاؤں میں دوسری سردیاں بھی آگئی اور وہ بڑا دن بھی آگیا۔ جب رات کو پہلی برف دبے پاؤں آگئی۔ جب چپکے چپکے برف کے ڈھیر لگ گئے۔ چپہ چپہ سفید ہو گیا اور گرم لحافوں میں سوتے ہوئے دیہاتوں کو خبر تک نہ ہوئی، ان کو برف کے سپنے تک نہ آئے، گاؤں میں روایت تھی کہ جو برف کو پہلے دیکھتا اور اس کا اعلان کرتا وہ برف کی بازی جیتا تھا۔ گاؤں والے اس کے سامنے ہار مان لیتے۔ سال بھر اس کی جیت زندہ رہتی، جب تک زمین کروٹ نہ بدلتی۔ ایک نئی برف کو لے آتی اور اتفاق کہیے یا قسمت کسی دوسرے کا ساتھ نہ دیتی۔ لیکن واسدیو نہ تو قسمت کو دیکھتا تھا نہ اتفاق کو۔ ایسے موقع پر وہ ہوا کو دیکھتا تھا۔ کئی دن سے انتظار میں تھا۔ دن چڑھے تک کیسے ہوتا؟ اس نے کھڑکی کھولی اور دیکھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو دیکھتے ہی چلا اٹھتا لیکن واسدیو اکیلا کیسے چلاتا۔ اس نے تلسی اور موہن کو لحاف میں سے نکالا، ان کی آنکھوں پر برف رکھ دی۔ ان کو جگایا اور برف کا تماشہ دکھایا۔ پھر کھڑکی کے پاس تینوں نے مل کر برف کے نعرے بلند کیے۔ (دو پی پی اور ایک پھٹا ہوا بانس سا)۔ ایک دم جیسے سمٹے ہوئے گاؤں کے ٹکڑے ہو گئے، جیسے خاموش برف میں گرج آگئی۔ گاؤں بھر گھبرا اٹھا اور ایک ایک فرد بند مکانوں، لحافوں اور اندر کی گرمیوں کو کوستا

اٹھا۔ انہوں نے کھڑکیاں کھولیں اور دیکھا۔ لیکن ان کی آوازیں کیسے نکلتیں؟ انہیں یقین تھا کہ واسدیو کی آواز میں جو پہاڑ سے پہاڑ تک چھا گئی ہے ان کی اپنی آوازیں ایسے کھو جائے گی جیسے برف کی ان جالیوں میں بارش کا ایک قطرہ کھو جاتا ہے۔ یوں تو ہر دل واسدیو کے ساتھ بول رہا تھا۔

''شینہ پیتو پیتو   مامہ یتو یتو''

یہ تو تھا اس دن کا آغاز، یہی ایک دھڑکن نہیں تھی جو یہ برف گاؤں میں لے آئی۔ دیکھتے دیکھتے پھوس کی چھتوں پر بھوت کھڑے ہوگئے۔ عالم گیر سفیدی کے پس منظر میں چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے لئے بھوت سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ایک بیلچہ، ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا اور ایک ایک دھڑام پر بچوں کے نعرے بلند ہوئے۔ کہیں بلی پھاندی پھنس گئی، کہیں کتا دوڑا دھنس گیا، کہیں ٹہنی ہلی، برف کی چادر گری اور کسی کے سر پر آ گئی، کوئی لڑھکا، کوئی پھسلا جس نے دیکھا اُسی کے قہقہے نہ رکے۔

واسدیو بھی اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ وہ بھی برف کے بیلچے چلا رہا تھا۔ لیکن واسدیو کا بیلچہ عام زاویوں میں کیسے اٹھتا؟ وہ بیلچہ برف کو کاٹ بھی رہا تھا اور برف کے ساتھ مذاق بھی کر رہا تھا۔ وہ کاٹنا بھی کیا تھا۔ اس میں گدگدی سی کرتا اور آگے دھکیلتا۔ برف اس کے بیلچے سے کبھی گیند کی طرح اچھلتی تھی، کبھی فوارے کی طرح ابلتی تھی۔ ہر بیلچے کے ساتھ واسدیو ایک نئے جانور کی بولی بولتا تھا۔ ایک ایسے موقعہ پر تلسی اور موہن واسدیو سے دور کیوں ہوتے؟ وہ دوسرے بچوں کی طرح نچلی کھڑکیوں پر کیوں ہوتے؟ واسدیو پھر چھت ہی کو کیوں صاف کرتا؟ اس کے دونوں بچے اس کے قریب ہی چھت کی آڑی کھڑکی میں کھڑے چلا رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔

لیکن اس دن واسدیو کی طاقت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا بیلچہ کانپنے لگا اور اس کے پاؤں دُکھنے لگے اور جب اسے یقین ہوگیا کی اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بیلچے چلائے۔ برف میں بڑے بڑے گھاؤ کئے اور بڑے بڑے مستطیلوں کو نیچے دھکیلا۔ ''کررر کررر دھپ۔ کررر کررر دھپ'' جیسے برف ترنگ کی ایک تیز تان بجائی جا رہی تھی اور جب اس کا درد بڑھتا ہی گیا۔ اس کا بیلچہ جلدی کے جنون میں چاروں طرف چلنے لگا اور برف ہر طرف اچھلنے لگی۔ جیسے تلسی اور موہن کی خاطر واسدیو اب برف کی ایک

آندھی چلانے لگا تھا۔ وہ ان کو یہ کیسے سمجھاتا کہ شدید بخار آ گیا ہے اور اس کی ٹانگیں برف میں جواب دے رہی ہے وہ ان کا ایسا بڑا دن کیسے بگاڑتا؟ کانپتا، ہلتا، تماشے کرتا، بچوں کو لے کر وہ آنگن میں اتر آیا جہاں چھت اور آنگن کی برف کا ایک بے ہنگم اور بدنما ٹیلا مکان کی دوسری منزل تک چڑھا ہوا تھا اس نے دیکھا کہ برف کا برا حال ہو گیا ہے۔ برف جس کی ہموار اور شفاف تہوں کو قدرت نے گالے پر گالا چن کے چڑھایا تھا۔ برف کا یہ حال دیکھکر اسے ایسا محسوس ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں بھی اپنی جگہ سے اکھڑ کر اس کے گوشت میں ایک جگہ ڈھیر ہو گئی ہے۔ لیکن برف کے اس میلے ڈھیر میں بھی کھیل تھے۔ اسنے تلسی اور موہن کی خاطر اس ڈھیر پر کئی اور بیلچے چلائے اور انہیں ایک سیڑھی کی شکل میں ڈھال دیا اور جب بچے برف پر چڑھنے، اترنے اور باہر باہر سے دوسری منزل کی کھڑکی میں کودنے، اچھلنے، پھسلنے میں مصروف ہو گئے، واسدیو موقعہ پا کر گرم زندگی کی جستجو میں چولھے کی طرف دوڑا۔ اس نے دو کانگڑیاں بھر دیں۔ جسم کی رہی سہی گرمی کو ایک موٹی لوئی سے باندھ دیا۔ اس کی بتیسی بھی بجنے لگی۔ اور اس کی ہڈی ہڈی کا درد بولنے لگا۔ لیکن اس نے چیخوں کو ایک بھنبھناہٹ میں دبایا جس کو سن کر تلسی اور موہن اندر دوڑے آئے اور کالی لوئی میں موٹے بھنورے کو دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ تلسی اور موہن کو ہنستے دیکھ کر واسدیو کی سانس ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ پھر اس نے بھنبھناہٹ کو اور تیز کیا اپنے دانتوں کو رہا کر کے خوب بجایا۔ اور تلسی موہن کو اور ہنسایا۔ لیکن کئی آہنی ہاتھ اس کی ہڈیوں کو ڈھونڈ رہے تھے، اس کی رگ رگ میں چیخ پکار تھی، اپنے بچوں کی ہنسیوں اور اپنی بھینچی ہوئی چیخوں کے درمیان اس نے پہلی بار ایک خلیج دیکھی۔ ڈور کمانی کو کاغذ بغیر لہراتے دیکھا، پہلی بار اس نے چاہا کہ وہ اکیلے رہے' چیخے روئے اور وہ ہنستے ہوئے دونوں آنگن میں چلے جائیں۔ جہاں پڑوس کے اور بچے جمع ہو گئے تھے، تلسی اور موہن کو للکار رہے تھے۔ برف کی جنگ کھیلنے آئے تھے۔ لیکن تلسی کو برف کے گولے کون بنا کے دیتا۔ دوسرے بچے اس سے بڑے تھے، وہ خود برف تیز تیز اٹھا سکتے تھے اور گولے بنا سکتے تھے۔ واسدیو نے دیکھا کہ دردوں کے پیچھے واسدیو ابھی جی رہا ہے اور تلسی کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے تہہ خانوں سے ایک ابال اٹھا، جس نے اس کی ہڈی ہڈی کو لپیٹا اور وہ اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں اپنے آپ کو کانگڑیوں سے الگ کیا۔ لوئی اتار دی اور آنگن میں تلسی کا مورچہ لگا دیا۔

تلسی دھڑ ادھڑ گولے برسانے لگی۔ واسدیو کی ایک ایک ہڈی ہڈی ٹوٹنے لگی۔ گولہ اور ہڈی، ہڈی اور گولہ واسدیو گولے بناتا گیا اور چلاتا گیا۔ ''وہ مارا، یہ مارا، مارا، مارا'' واسدیو جی بھر کے چلایا اور تلسی نے جی بھر کے گولے برسائے۔

پھر اس برفوں کے گرم دن پر بھی رات چھا گئی۔ تلسی موہن اور واسدیو خاندانی لحاف میں گھس گئے۔ واسدیو نے ان دونوں کو گرمی کی تلاش میں بھینچ لیا۔ اس کی سنگین ہمت جواب دے رہی تھی۔ درد سے زیادہ شدت کا اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ نہ نکل آئے اور تلسی موہن گھبرا نہ جائے۔ ''کاکا کہانی''، تلسی نے اس کے سینے پر سر رکھا اور فرمائش کی۔ لیکن اس رات کی کہانی گم ہو چکی تھی۔ واسدیو کی زبان بس ''ہائے'' کر سکتی تھی اور چونکہ اس کی زبان اور اس کے ہونٹ مدت سے ٹیڑھے ہلتے رہے تھے۔ اس وقت بھی اسکی ہائے عجیب عجیب سروں میں نکلتی چلی۔ وہ ہائے کرتا اور اس کا منہ کبھی سُر نائے بنتا، کبھی پی پی۔ ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں اس کی صورت، اس کی آواز سے بھی عجیب دکھائی دیتی تھی، تلسی اور موہن سر اٹھا کر ہنستے گئے۔ وہ ہائے پر ہائے کرتا گیا اور بچے ہنستے گئے۔ اس کا عضو عضو ٹوٹتا گیا حتی کہ اس کے ہنسانے کے ارادے ٹوٹ گئے۔ پھر اس کی سرنائے اور پی پی ٹوٹ گئی۔ اس نے ہڈیوں پر موت کو رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کراہنے لگا۔ رونے لگا اور تلسی موہن دونوں ہنستے ہی گئے۔ اس رات کی طرح وہ کبھی ہنسے نہ تھے، واسدیو کا ناٹک بھی تو اس دن اتنا اچھا تھا۔ وہ ہنستے گئے۔ ہنستے گئے اور جب واسدیو کی آنکھیں دیئے کو بھی نہ دیکھ سکیں اور اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ سنجیدہ سروں میں انہیں بتا دے کہ یہ سب کچھ سچ ہے اس کی زبان نے اس کا پورا ساتھ نہ دیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور ان کی ہنسی تیز ہوتی گئی۔

واسدیو کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں چوڑی ہوتی گئیں۔ شاید وہ اسی دیئے کو کھوج رہا تھا۔ شاید اُس اندھی ہنسی سے ڈر گیا تھا...... اس ڈرے ہوئے کو اگر تلسی اور موہن اس وقت دیکھ لیتے شاید وہ بھی ڈر جاتے لیکن انہیں بھی نیند آ گئی اور انہیں اس بھیانک ماحول سے اٹھا لے گئی۔

دوسری صبح تلسی کی آنکھ بہت دیر میں کھلی۔ کاکا لحاف میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ چشمے پر سموار دھونے گیا ہوگا۔ پھر موہن بھی جاگ اٹھا اور دونوں لحاف میں چور کوتوال کھیلتے ہوئے لحاف سے باہر واسدیو کی لاش سے ٹکرائے۔ چشمے پر کاکا کہاں گیا تھا۔ وہ تو وہیں پڑا

ہوا تھا۔ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے تھے۔ اس کے سینے پر چڑھے، انہوں نے اس کے منہ کو ہلایا، اس کا نیا رنگ، منہ کے نئے گراوٗ، ایک نئے جانور کے جیسے تھے، ہنسیوں کی نئی اکساہٹ کے سامنے کیسے نہ ہنستے، وہ ہنستے ہی گئے جب تک کہ موہن کی ہنسی بھوک کے مارے رونے میں تبدیل ہوئی اور تلسی نے بھی ہنسی روک کر واسدیو کو کھیل ملتوی کرنے کو کہا۔ لیکن جب واسدیو نے اپنے چہرے کے زاویئے درست نہیں کئے، باتوں کا جواب نہیں دیا تو تلسی بھی روٹھ گئی۔ وہ بھی رونے لگی ''کاکا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کانگڑی کی آگ بجھ گئی ہے۔'' لیکن واسدیو ناٹک میں ہی پڑا رہا۔ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس غیر معمولی ضد پر تلسی کے ننھے دل میں بھی حیرت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئی اور وہ ڈرنے لگی۔

''نہیں نہیں کاکا۔ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔ تم اماں مت بنو کاکا۔ اماں مت بنو۔ اماں والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کاکا۔ اماں مت بنو کاکا......''۔

☆☆☆

ٹھاکر پونچھی

زندگی کی دوڑ

آگے برساتی کھڈ تھی..........!!

ٹانگے والے نے کہا۔ "آپ کو یہیں اترنا ہے۔ اس برساتی کھڈ میں آگے بڑھتے جائیے۔ یہ سیدھی آپ کو چودھری جی کے گھر لے جائے گی۔"

اس نے اٹیچی کیس لیا اور کھڈ میں ہو گیا۔

یہ برساتی کھڈ موڑ کاٹتی ہوئی آس پاس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے بیچ بڑھتی جا رہی ہے..... اسے ایسے معلوم ہونے لگا کہ یہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے بھاگتی جا رہی تھی۔ اونچے اونچے برفانی پہاڑ جو اس سے سوکھے پیاسے چھوڑ پانی کو اپنی آغوش میں چھپائے بیٹھے تھے.... وہ سوچنے لگا۔ دنیا میں ہر ایک چیز جان بے جان کسی مقصد کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہی ہے۔ جو بھاگ دوڑ نہیں سکتے وہ "صم" "بکم" کھڑے اس آرزو کے پورے ہونے کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اور ایک دن ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے... اس برساتی کھڈ کا بھی۔ ان بے شمار بڑی بڑی عظیم چٹانوں کا بھی، اور "صم" "بکم" کھڑے درختوں کا بھی... اور اسے بھی تیزی سے آگے بڑھنا چاہئے۔ اس برساتی کھڈ کی طرح، تاکہ جلدی منزل پر پہنچ سکے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔

راستے میں آموں اور بڑ کے درختوں کی ملی جلی چھاؤں میں ایک پانی کا کنواں تھا کوئی دو بالشت گہرا۔ اس نے پتھر کی سیڑھیاں اتر کر پانی پیا۔ اور پھر کوٹ کو زمین پر بچھا کر اٹیچی کیس کو سرہانہ بنائے لیٹ گیا۔

سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور اس کی روپہلی کرنوں کی چمک دمک سے کھڈ کی ریت جھلملاتی رہی تھی۔ حد نظر تک ایک نقرئی چادر تھی۔ پھیلتی سمٹتی بڑھتی جا رہی تھی۔ کہیں کہیں ڈور ڈنگر گھاس کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ دور کہیں سے گانے کی آواز سنائی دی، جو ہوا کا ایک ریلا اس تک لے آیا تھا۔ لیکن آم اور بڑ کے پتوں کی

سرسراہٹ میں وہ کچھ بھی نہ سن سکا۔ اور ہوا کے دوسرے جھونکے کے انتظار میں کان لگائے بیٹھ گیا... آواز اب بلند ہوتی جارہی تھی۔ کوئی گارہا تھا۔ سامنے پہاڑی کے ٹاہلی اور پھلائی کے گھنے درختوں میں!

پیلو چن چن بھری پٹاری

یار نہ ملیا جاندی باری

آساں رکھیاں رکھیاں یاد تیری دے نال

(پیلو چن چن کر میں نے پٹاری بھر رکھی تھی۔ لیکن جاتی دفعہ میرا محبوب مجھے نہ ملا۔ میں نے تیری یاد میں مبہوت بیٹھے تیری آس پاس کا دامن نہ چھوڑا)

آواز ایک بار خلا میں گونج کر مدھم ہوگئی.. آساں رکھیاں .....اور پھر خلا میں ہی گم ہوگئی......۔

وہ سوچنے لگا......کوئی عورت گارہی ہوگی۔ اپنے محبوب کی یاد میں......اس کے انتظار میں...... بیوقوف! وہ ہنسنے لگا اسے معلوم نہیں کہ مرد کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ اور نہ ہی کسی سے محبت۔ ان کی محبت وقتی ہوتی ہے۔ صرف ایک خاص وقت کے لئے۔ اور پھر...... یہ پگلی ہر سال پیلو چن چن کر اس کا انتظار کریں گی اور ایک دن نہ اس کا اپنا وجود ہوگا نہ ہی کسی کی یاد اور نہ ہی یہ دن......!!

اس نے گھڑی دیکھی، بارہ بجنے والے تھے۔ اور اسے دوپہر ڈھلنے سے پہلے پہلے چودھری جی کے گھر پہنچنا تھا۔ وہ جاگیردار تھے۔ اور ان کی جاگیر میں وہ پہلی بار جارہا تھا۔ اور اب وہ اپنی ممیری بہن کی شادی میں شرکت کرنے جارہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کئی بار ارادہ کیا تھا، لیکن عدیم الفرصتی کا فرض دامنگیر رہا۔ اور اب وہ بغیر ان کو اطلاع دیے آ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا۔ اطلاع پاتے ہی اس کے ماموں گھوڑا بھیج دیں گے۔ اور بہت سے زمیندار، مزدور اور وہ جلوس کی شکل میں گاؤں میں داخل ہونا نہ چاہتا تھا۔ وہ اس گہما گہمی سے گھبراتا تھا۔ اس نے سوچا، آخر بھولتے بھلاتے پہنچ ہی جائیں گے۔ اور لطف بھی آئے گا۔

گھر پہنچا تو ماموں نے جھاڑ دینی شروع کر دی۔ چوروں کی طرح آئے ہو، رنگ تو دیکھو، دھوپ میں کیسا سیاہ ہوگیا ہے۔ پہلے سے اطلاع دی ہوتی تو سواری کا بندوبست کیا جاتا۔ آٹھ نو میل کا سفر خواہ مخواہ کرنا پڑا۔

ممانی نے تو بات کا تبنگڑ بنادیا۔ ہمیں رشتہ دار تھوڑا ہی سمجھتے ہو۔
دروازے پر تین گھوڑے بندھے ہیں، آخر کس لئے۔ آج کل کے چھوکروں سے تو پرماتما بچائے۔ جو من میں آتا ہے وہی کرتے ہیں، چاہے اس میں کسی کی ناک کیوں نہ کٹ جائے''۔

''چودھری نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''بوا کا کیا حال ہے؟''

''اب قدرے افاقہ ہے۔ دراصل میرے آنے کا پروگرام بھی تو کل ہی بنا ہے۔ ماتا جی نے مجبور کیا کہ اب انہیں آرام ہے کوئی فکر کی بات نہیں، اور پھر ہم میں سے کسی کا پہنچنا اشد ضروری تھا۔ بابو جی گھر پر رہے اور میں چلا آیا۔ ویسے بھی مجھے آپ کا گاؤں دیکھنے کا ازحد شوق تھا۔'' اس نے گھر میں آئے ہوئے لوگوں پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

گھر میں جمع گاؤں کی لڑکیاں بھاگی بھاگی اسے دیکھنے آنے لگیں، پیازی، بسنتی اور گلابی دوپٹے ایک طرف سے آتے اور دوسری طرف سرک جاتے۔

چودھری جی کہنے لگے۔ ''چلو اندر چلو۔ کھانا کھالو۔ سارا دن پڑا ہے باتیں کرنے کو!''۔

اندر رسوئی خانے کے آنگن میں ڈھولک بج رہی تھی۔ اور گاؤں کی شوخ وشنگ لڑکیاں سریلی مدبھری آواز میں گا رہی تھیں۔

چن چڑھیا سوہنا عالم دیکھے میں دیکھوں سہانا مکھ یار دا

(خوبصورت چاند نکل آیا۔ اور ساری دنیا اسے دیکھنے لگی۔ لیکن میں اپنے محبوب کا سندر مکھڑا دیکھتی رہی۔ اور اس کی خوبصورتی میں کھوئی رہی)۔

لڑکیاں مست چڑیوں کی طرح چہچہا رہی تھیں، کلیانؔ دبک کر ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اس نے سب لڑکیوں کو ایک نظر دیکھا۔ جو اسے دیکھ کر ڈھولک پر جھک گئی تھیں، اور پھر اس کی نظریں ڈھولک پر جم گئیں۔

''یہ آمرؔ ہے ہمارے پروہت جی کی لڑکی۔'' اس کی ممانی جیسے اس کے دل کی بات تاڑ گئی تھی۔ اور آمرؔ نے اپنی چھوٹی چھوٹی نیم واشربتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس پر جیسے بجلی سی گر پڑی ہو۔ وہ گھم سم کھڑا رہا۔

''اور وہ کلیانؔ دبکی بیٹھی ہے۔ رات کہہ رہی تھی بھیا نہیں آیا۔ اور جب تم آئے ہو بات تک نہیں کی''۔ اس کی ممانی کہتی ہوئی چلی گئی۔ اور وہ کلیانؔ کے پاس جا کر بیٹھا۔ لیکن اس کی نگاہیں بار بار آمرؔ کے چہرے پر جا کر جم جاتیں۔

کھانا کھاتے وقت امر بار بار اس کے پاس کبھی پانی دینے اور کبھی اور کوئی دوسری چیز دینے آتی رہی اور وہ اس کی مخروطی سنگ مرمر کی بنی ہوئی انگلیاں کو دیکھکر بھی یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اس گجروں بھری کلائی زیادہ خوبصورت ہے، یا مخروطی انگلیاں۔ باہر آم اور امرود کے پیڑوں تلے دس بارہ مرد کانوں میں انگلیاں رکھے لمبی لمبی آوازیں نکال رہیں تھے۔ کوئی گیت نہ تھا اور نہ ہی الفاظ۔ صرف گلے کے ہیر پھیر سے لمبی لمبی سریلی آوازیں نکال رہیں تھے۔

وہ سوچنے لگا۔ ان دیہاتی لوگوں اور قدرت میں کتنے نزدیک کی مناسبت ہے۔ قدرت کے سرور انگیز گیتوں کی طرح ان کے گیتوں میں بھی الفاظ نہیں ہوتے۔ جھرنوں کے پرسوز گیت بھی تو بغیر الفاظ کے ہیں۔ چیڑھ کے نکیلے جھومروں سے سرسراتی ہوئی ہوا بھی تو یوں ہی گنگناتی ہے۔ لیکن کتنا سوز، کتنی گہرائی۔۔۔ ایسا احساس ہوتا کہ یہ آواز روح میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ کچھ عرصہ کیلئے اپنے آپ میں، اور اس جاں گداز آواز میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اس آواز کا ایک جز ولاینفک... اور اگر یہ الفاظ پیدا کرتے، تو شاید اتنا سوز اور اس قدر موسیقی ان میں نہ ہوتی۔ اپنی ساری انفرادیت اور لازوال حسن گنوا بیٹھتے۔ اور ان گانے والوں کی جاں گداز آواز کی لے اور اس کے زیر و بم میں قدرت کی تمام آوازیں سمائی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ جھرنے کی مدبھری آواز بھی اور چیڑ کے نوکیلے جھومروں سے سرسراتی ہوئی ہوا کی سرور انگیز لے بھی ...وہ کتنے ہی عرصہ تک ان کی آواز کے زیر و بم میں کھو کر سامنے برساتی کھڈ کے رتیلے موڑوں میں بھٹکتا رہا۔ اگر اسے تہذیب اجازت دیتی، تو وہ بھی ان میں بیٹھ کر اونچی اونچی آواز میں سُریں نکالنے لگتا۔ دور، کہیں بہت دور آم کے پیڑ پر کوئل بول رہی تھی۔

رات کو وہ جلدی ہی سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے سوچا کل رات کو برات آنی ہے۔ ساری رات جاگنا پڑے گا۔ اور پھر اب اسے قدرے سفر کی تھکاوٹ بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ ابھی سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا، کہ امر دودھ کا گلاس لے کر آ گئی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"دودھ ہے" امر نے کہا۔

وہ خاموش لیٹا رہا۔

اس نے دوبارہ کہا۔ "چودھری جی نے دودھ بھیجا ہے۔"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''دودھ تو میں کم ہی پیتا ہوں''۔اس نے بناوٹی جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب لے آئی ہو تو پی ہی لیتا ہوں''۔

''اگر نہیں پیتے تو خواہ مخواہ تکلیف کی ضرورت نہیں، میں واپس لے جاتی ہوں''۔اس نے بڑھایا ہوا ہاتھ بھینچتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ خاموش اُسے دیکھتا رہا۔جیسے اس نے کچھ بھی نہ سُنا ہو۔اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں، اس نے دیکھا امر بھی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

''امر......!''

''جی......!''

''تم یہاں کہاں گاؤں میں پیدا ہوئیں''۔وہ ہنس دی۔ ''دودھ پیجئے۔گلاس واپس لے جانا ہے''۔

لیکن وہ دیکھتا رہا۔اُس کے تنویر صبح کی طرح سرور انگیز اور شفق جیسے شگفتہ چہرے کو، اس کی نیم واشربتی آنکھوں کو، اس کے کانپتے ہوئے یاقوتی ہونٹوں کو،.....اور پھر غیر شعوری طور پر اس کے ہاتھ آگے بڑھنے لگے۔وہ چاہتا تھا کہ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لے۔

''ابھی نہیں پیا؟'' چودھری جی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''بہت زیادہ گرم ہے''۔ اس نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''امر اندر سے تولیہ لے آؤ''۔

امر تولیہ لینے اندر چلی گئی۔اور وہ چودھری جی سے باتوں میں مشغول ہوگیا۔صبح بستر پر پڑے پڑے اس نے رات کی بات پر نظر ثانی کی، اُس نے محسوس کیا، کہ جو کچھ رات کو کیا گیا، وہ عقلمندی سے بعید تھا۔اگر امر اس بات کا ذکر کسی سے کردے تو کئے کرائے پر پانی پھر جائے.....اور وہ خود بھی نہ سمجھ سکا کہ رات کو اُسے کیا ہوگیا تھا۔اس نے زندگی میں پہلی بار اتنی حسین چیز دیکھی تھی۔

چودھری جی کہنے لگے۔ ''دوسرے کھیتوں میں کنواں ہے، وہاں نہا آؤ۔اور ساتھ ہی لیموں اور سنگتروں کے باغ بھی دیکھتے آؤ۔پروہت جی ساتھ جائیں گے''۔کنوئیں پر جاتے ہوئے راستے میں انہیں گاؤں کی لڑکیاں ملیں، پریشانی اور چہرے پر ادھر اُدھر بال بکھرے ہوئے، نیلگوں آسمان پر ساون کی بدلیوں کی طرح۔آگے آگے کلیان تھی۔

پروہت جی پھلائی کے پیڑ سے داتنیں بنانے لگے۔

امر نے شرارت آمیز لہجہ میں اس سے پوچھا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے رات کو آپ سوئے نہیں''۔

''کیوں۔۔۔۔؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ رات کا حادثہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

آنکھیں بتا رہی ہیں۔'' امر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

کلیان نے اسے روک دیا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہو۔''

وہ بھی اُن کے ساتھ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اور بات کا مذاق اُڑاتے ہوئے بولا۔ ''ساری رات ڈھولک بجتی رہی ...... ساری رات چاند چمکتا رہا۔ اور دنیا اُسے دیکھتی رہی...... چن چڑھیا کُل عالم دیکھے .... اور کوئی بے چارا تھا، کہ بس اندر ہی اندر بیٹھا اونگھ رہا تھا...... نہ نیند آتی تھی اور نہ ہی آنکھیں کھلتی تھیں۔''

ایک قہقہہ بلند ہوا...... امر نے آنکھیں نیچی کر لیں ...... پروہت جی بھی دانتیں لئے آ گئے۔ سب کو اِس طرح ہنستے دیکھ کر وہ بھی ہنسی میں شامل ہو گئے۔۔ وہ دور تک امر کو پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا۔ شاید اسے پھر اس طرح بدلیوں میں گھرا ہوا چاند نظر نہ آئے۔

پروہت جی کہنے لگے۔ ''ان لڑکیوں کی زندگی بھی کیا ہے۔ آج کچھ کل کچھ، یہ امر میری بھتیجی ہے۔''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے پروہت جی کو دیکھا۔۔ ''لیکن ممانی نے آپکی بیٹی بتایا تھا۔''

''ہاں !...... وہ بھی ٹھیک تھا۔ چھوٹی ہی عمر میں میرا بھائی مر گیا تھا۔ اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد امر کی ماں بھی مر گئی۔ میں نے ہی اسے پال پوس کر بڑا کیا۔ اس کی پرورش میں، میں نے کتنے دُکھ جھیلے۔ قدرت نے اسے مجھ سے چھیننے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اور یہ سب کچھ چودھری جی کے کارن ہی تھا۔ اُن کی سخاوت کا دروازہ ہمیشہ میرے لئے کُھلا رہا اور ان کی ہی امداد سے میں نے امر کی شادی بڑے دھوم دھام سے رچائی۔'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تو امر شادی شدہ ہے؟'' پروہت جی نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''ابھی پچھلے سال ہی اس کی شادی کی گئی تھی .... پچھلے سال اور اس سال میں کتنا فرق ہے... اور آج... آج...'' پروہت جی کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

اُس نے خاموش پروہت جی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس معمّے کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے پھر کچھ وقفے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''شادی کے دو ماہ بعد امر کا گھر والا بھرتی ہو کر لام پر چلا گیا۔ اندھے باپ نے منتیں کیں، لیکن وہ نہ مانا۔ میں نے جا کر سمجھایا۔ کہنے لگا...... زمینداری سے تو تین چار ماہ بمشکل نکلتے ہیں۔ اور اس مہنگائی کے زمانہ میں کہاں سے خرید خرید کر کھائیں گے...... پڑھا لکھا تھا، ایسی ایسی نظیریں دیں، ایسی ایسی دلیلیں پیش کیں، کہ ہم اس کا منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔ وہ ایسی گھڑی گیا، کہ واپس آنے کا نہ رہا ....پچھلے ماہ ہی چودھری جی کو معلوم ہوا کہ وہ لام پر مارا گیا....''۔

''یعنی امر بیوہ ہے...... یہ کیا کہا...... امر کبھی بیوہ نہیں ہو سکتی۔'' اُسے ایسا احساس ہوا، کہ وہ ایک بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔

''ہاں اور ہم نے بھی امر کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔'' پروہت جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''سوائے میرے اور چودھری جی کے اور کسی کو علم نہیں' اس کے اندھے باپ کو بھی ابھی تک معلوم نہیں..... اس لئے تاکہ امر کچھ دن اور سہاگ کے دیکھ لے۔ اپنی سہیلیوں میں ہنس کھیل کر۔ اور پھر....''

'اور پھر؟'' ......وہ سوچنے لگا۔ امر کی آئندہ زندگی میں کبھی سحر نمودار نہ ہوگی کبھی بھی صبح کی تنویر نظر نہ آئے گی۔ آفتاب کی سُنہری شعاعیں کبھی نہ چمکیں گی، ساری عمر سوگ اور ویوگ میں گذارنی پڑے گی۔ اور پھر اس کی مسلسل ہچکیاں، موت کی منتظر کھلی ہوئی آنکھیں، جوانی کی معصوم بے ہوش راتیں اُسے سراپا غم بنا دیں گی۔ اور پھر یہ حسین معصوم اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو جائے گی...... یہ ہیں عورتوں کے لئے اُن کی عزت و عفت کے محافظوں کے بنائے ہوئے قانون۔ اور یہ ہے عورت کی زندگی کی دوڑ...... پیدائش، شادی اور بیوگی۔۔۔ مرد اسّی سال کی عمر میں شادی کر سکتا ہے، لیکن عورت سولہ سال کی عمر میں بیوہ رہنے کے لئے مجبور کر دی جاتی ہے.... اور امر بھی تو بہ مشکل ابھی جوانی کے سن تک پہنچی تھی۔ اس نے کہا۔ ''آپ امر کی دوسری شادی کر سکتے ہیں۔ اس نے ابھی اپنی زندگی کے کون سے دن دیکھے ہیں۔ وہ کس کے سہارے جی سکے گی؟''

'ہاں' میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن چودھری جی نہیں مانتے۔ کہتے ہیں' کہ آج تک ہمارے گاؤں میں ایسا نہیں ہوا....''

اور وہ سوچنے لگا۔ جو کچھ ان گاؤں اور شہروں میں اس کی بدولت ہو رہا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ نہ ہی تو اسے چودھری جی کا اثر و رسوخ روک سکے گا۔ اور نہ ہی اُن کی دولت ہی۔ دیکھتے سنتے ہوئے بھی یہ لوگ جھوٹی عزت و آبرو کے نام پر کیوں مٹے جا رہے ہیں۔ ہزاروں سال کی تہذیب بھی ہمیں ابھی تک اس تاریک گڑھے سے نہ نکال سکی۔ اور کتنی صدیاں لگ جائیں گی اِس تاریک گڑھے سے نکلنے میں۔۔۔ وہ کتنے ہی عرصہ تک بُت بنا ان ہی خیالات میں گم رہا......!!

رات کو برات خوب شان و شوکت سے آئی۔ شہنائیوں اور طنبوروں کی آواز پر گھوڑے ناچتے ایک تال پر آگے بڑھ رہے تھے۔ آتشبازیاں چھوٹتے ہی آسمان کی طرف بھاگ جاتیں۔ اور رنگ برنگ کے تارے فضا میں بکھر جاتے۔ درختوں پر سوئے ہوئے پرندے بھی شور و غل سے گھبرا کر ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ فضا میں ایک ارتعاش تھا، ساری کائنات ہاتھ پھلائے ہوئے اس جشن کا استقبال کر رہی تھی۔

دولھا میاں ؁ چالیس اور پچاس کے درمیانی حصّہ سے گذر رہے تھے۔ اور غالباً یہ اُن کی تیسری شادی تھی۔ اور چودھری جی جیسے پڑھے لکھے جاگیر دار اس سے پندرہ سولہ سال کی کلیان کو بیاہ رہے تھے۔ بے ڈول سا جسم، منہ پر چیچک کے داغ، اندر کو دھنسی ہوئی مریل سی آنکھیں، البتہ مونچھوں کا تاؤ خاندانی وقار کو سنبھالے ہوئے تھا۔۔۔ نام تھا شیر سنگھ......شیر سنگھ.....اور وہ سوچنے لگا۔ شیر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، اس نے ایسا ہی سُنا تھا۔ اور شاید اسی لئے چودھری جی نے کلیان کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شیر تیسری شادی کر رہا تھا۔ اپنی مری ہوئی آرزوؤں اور بے حس تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے ایک پندرہ سولہ سالہ بھولی بھالی دوشیزہ کی جوان امنگوں کو مٹا رہا تھا، اور چودھری جی ......شاید انہیں اچھا بَر نہ ملا ہوگا۔ یا لڑکا ملا ہوگا وجیہہ پڑھا لکھا، لیکن خاندانی وقار نے آڑے ہاتھوں لیا ہوگا۔ وہ خاندانی لحاظ سے کم تر ہوگا اور شیر سنگھ ایک جاگیر دار، ہزاروں کا مالک، وہ تیسری شادی کر سکتا ہے۔ دولت دنیا کا منہ بند کر دیتی ہے......وہ دولت مند ہے اس لئے کلیان کو چودھری جی اس کے گلے مڑھ رہے ہیں، آگ اور پانی کو ملایا جا رہا ہے۔ لیکن سب خاموش ہیں، سب کے منہ بند ہیں، سب مسرّت سے جھوم رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کچھ نہیں ہو رہا، کچھ نہیں ہوگا.... ہاں شیر سنگھ کی تعریفوں کے پُل باندھے جا رہے ہیں

تھے۔اور چودھری جی کو اس حُسن انتخاب پر داد مل رہی تھی، اور ان کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ زرق برق کپڑوں، سونے کے ہاروں اور قیمتی نگینوں کی چمک دمک کو دیکھ کر کئی مائیں سوچ رہی تھیں، کاش! ان کی جوان لڑکی کے لئے بھی شیر سنگھ ایسا بر ملتا...... یہ ہے دنیا ایک امیر کی دنیا...... ایک مرد کی دنیا......!!

لیکن امر...... امر عورت ہے اور بیوہ...... اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہے گی۔اور جب ساون کی بدلیاں ناچ ناچ کر آنگن میں اُتر آئیں گی...... موسم سرما کی خاموش ٹھنڈی چاندنی راتوں میں چاند اپنی سُنہری شعاعوں کے ذریعے سے چکور کو محبت کے پیغام سُنائے گا ...... کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں کی سوز بھری سرور انگیز آواز دور دور تک پھیلتی ہوئی ابر آلود پہاڑوں میں گم ہو جائے گی، تو اس کے جذبات اور احساسات، سماج اور اس کے بنائے ہوئے کئی مضبوط بندھن اپنے ساتھ بہالے جائیں گے۔اور پھر اس گاؤں میں، وسیع و عریض دنیا کی لامحدود وسعتوں میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ رہے گی۔گاؤں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیگا دنیا کی یہ لامحدود وسعتیں سکڑ جائیں گی اور پھر۔کیا یہی ہے عورت کی زندگی کی دوڑ.... پیدائش، شادی اور بیوگی...... ویشیا!...... شاید سماج کے پاس اس سے بڑھ کر عورت کے لئے کوئی خطاب نہیں۔

ہون کنڈ کے پاس بیدی میں بیٹھے ہوئے پنڈت اونچے اونچے سُروں میں منتر الاپ رہے تھے۔آگ کے شعلے لمبی لمبی زبانیں نکالے لپکتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ہون کنڈ آج کسی انسان کی قربانی مانگ رہا تھا...... سُرمئی کپڑوں میں ملبوس کلیان روتی ہوئی دو عورتوں کے سہارے آہستہ آہستہ بیدی کی طرف جا رہی تھی،...... اسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ ستی ہونے جا رہی ہے...... لپکتے ہوئے شعلے ہنستے ہوئے معلوم ہونے لگے۔سماج ہنس رہا تھا اور کلیان سسکتی ہوئی قربان گاہ میں داخل ہو رہی تھی۔اور چاند آم کے درختوں کی اوٹ میں دم روکے سب کچھ دیکھ رہا تھا...... اب فضا میں ارتعاش کی جگہ جمود تھا۔اور پنڈت گلا پھاڑ پھاڑ کر اس صدیوں کے پھیلے ہوئے جمود کو توڑنے کی ناکام سعی کر رہے تھے...... وہ تخیلات میں کھو گیا۔ تخیلات تصور میں اور تصور واہمہ میں بدل گیا۔

دور کہیں ٹاہلی اور پھلائی کے گھنے درختوں میں سے اُسے آواز سنائی دینے لگی "آساں رکھیاں رکھیاں سجنا یاد تیری دے نال"۔

☆☆☆

موہن یاور

کینواس

پال نے کافی کے کڑوے، اور کسیلے گھونٹ بھرنے کے بعد، اُس تخیل کو گرفت میں لانے کی کوشش کی، جو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح اُڑ رہا تھا، سگریٹ تخیل اور زندگی۔

اس کی زندگی بھی اسی دھواں کی مانند تھی، جسے پانے کے لئے وہ بھاگ رہا تھا، دوڑ رہا تھا۔ اور زندگی آگے آگے بھاگ رہی تھی۔ دوڑ رہی تھی اور وہ تعاقب کر رہا تھا۔

کافی کا کپ پی کر وہ گولڈ فلیک کے سگریٹ کا دُھواں اُڑانے لگا۔ پھر اس نے فاؤنٹین پین سے اسکیچ بک پر چند خاکے اُبھارے، جو اس کے ذہن کی سپاٹ سڑک پر دوڑ رہے تھے۔

اس نے ایک کپ کافی کا اور آڈر دیا۔

جب بھی اُس کے پاس پیسے ہوتے وہ کافی ضرور پیتا اور کافی کے ساتھ گولڈ فلیک کی نصف ڈبیہ ضرور پھونکتا۔ یوں تو اُسے عام طور پر بیڑی میں ہی مزا آتا تھا

سگریٹ کا دُھواں اُڑا کر اس نے کافی کی چسکی لی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا گھر گھومنے لگا۔

اس کی ماں کوئی فراک سی رہی تھی، مشین روک کر کہنے لگی۔

بیٹا۔ تو نے یہ کیا کام پکڑ لیا، کب تک تصویروں میں رنگ بھرتا رہے گا۔ تیری زندگی سدا بے رنگ ہی رہے گی کیا؟

"ماں۔ ذرا صبر کر........"

"کب تک صبر کروں بیٹا۔ گھر میں بہو آجاتی تو میں بھی چین سے مر جاتی۔ مگر تو کچھ کمائے بھی۔ کون دے گا تجھے لڑکی۔"

"ماں! مجھے لڑکی نہیں چاہیے۔ لڑکی۔ لڑکی۔ دنیا میں کچھ اور بھی ہے لڑکی کے سوا"۔

"اب تجھے۔ میں کیا سمجھاؤں بیٹا! کب تک مشین چلاتی رہوں گی میں۔ آنکھیں تو پہلے ہی ساتھ چھوڑ چکی ہیں، اب ہاتھ بھی جواب دے رہے ہیں۔ میں تھک گئی بیٹا...!!

''ماں!''

''بیٹے دہراؤ وہ جملے جو تو کئی برسوں سے مجھ ابھاگن کو سنا تا رہا ہے کہ........زندگی سنور جائے گی ماں ۔تصویروں کا کوئی قدردان تو مل جانے دو۔ پھر دیکھنا، چاندی ہی چاندی ہو گی۔ بیٹے ۔مگر کب ہو گی چاندی۔ جب میں دُنیا سے اُٹھ جاؤں گی۔''

''ماں............!!''

اور گھر کا ماحول دھندلا گیا۔ ماں چلی گئی۔

کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

اس نے چسکی لی اور پھر سگریٹ سُلگا کر سوچنے لگا۔

''اس کی ماں کتنی اچھی ہے، دُکھ سہہ لیتی ہے مگر چیختی نہیں۔ کب سے دُکھ سہتی چلی آرہی ہے مگر وہ ابھی تک اپنی ماں کا ہاتھ بھی نہ بٹا سکا۔ وہ عورت، گھر کا دھندہ چلا رہی تھی اور وہ مرد ہو کر......وہ ناکارہ نہیں تو اور کیا ہے؟ نکما......کیا سب ہی آرٹسٹ نکمے ہوتے ہیں۔ یا ان کو روزگار نہیں ملتا۔ کیا ان کا فن یونہی سڑتا رہتا ہے کیا ان کا کوئی قدردان نہیں ۔ تصویریں یونہی دیمک کی چاٹ بن جاتی ہیں۔ کیا وہ تمام عمر بھوکے ہی رہتے ہیں کب تک وہ اپنی بوڑھی ماں کے کمزور ہاتھوں سے کمائے ہوئے ٹکڑوں پر زندہ رہے گا۔ وہ ٹکڑے جن میں اس کی ماں کی آنکھوں کی روشنی اور ہاتھوں کی محنت رچی ہوئی ہے مگر ان روٹی کے ٹکڑوں کا بھی کیا بھروسہ؟ جانے کب یہ ٹکڑا چھن جائے۔ آخر اس کی ماں کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا دیا بجھ جائے گا۔ پھر گھر میں بالکل اندھیرا ہو جائے گا......اندھیرا......!!

کئی بار وہ ارادہ باندھتا کہ وہ آئندہ تصویریں نہیں بنائے گا۔ خون سے سینچی ہوئی تصویریں آگ کی نذر کر دے گا، برش اور رنگ چولہے میں پھینک دے گا اور چپکے سے کسی دفتر میں کلرک بھرتی ہو جائے گا۔

کلرک نہیں وہ کلرک نہیں بن سکتا......!

وہ پھر دن رات تصویریں بنانے لگا۔ اُس نے ایسی تصویریں بھی تیار کیں، جن کا تخیل اچھوتا تھا اور رنگوں میں زندگی تھرکتی نظر آرہی تھی مگر یہ تصویریں لوگوں کو پسند نہ آسکیں، وہ خاکوں کو سمجھ نہ سکے۔ چند ایک تصویریں رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں، چند ایک فروخت بھی ہو گئیں۔ جن سے اس نے تصویروں کی زندگی کی گاڑی کو آگے دھکیلا اور اسطرح یہ

گاڑی چلتی رہی۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اور نیا سگریٹ سُلگا کر سوچنے لگا۔ کہ وہ دن ضرور آئے گا جب اس کا نام ہر ایک کی زبان پر ہوگا۔ ہر گھر میں اس کی تصویریں لٹک رہی ہوں گی۔ وہ دن دور نہیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ دن آ کے رہے گا۔

''مسٹر پال۔ آپ جانتے ہیں کہ.........'' اس کے پاس بیٹھے ہوئے کسی شخص نے اس کی سوچ کی کڑی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''جی.........کیا؟''

''آپ نہیں جانتے کہ بارہ دسمبر کو آرٹ ایگزبیشن ہو رہا ہے۔''

''آرٹ ایگزبیشن.......مگر کہاں؟''

''گورنمنٹ آرٹ ایمپوریم میں۔ اور سنا ہے کہ بڑے بڑے نامی گرامی آرٹسٹ اس میں حصّہ لے رہے ہیں۔ کیا آپ بھی وہاں اپنے شاہکار کی نمائش کریں گے۔''

''شاہکار......!!''

اور پال نے جلدی سے بل چکایا اور تیزی کے ساتھ اپنے گھر کی طرف ہولیا۔ گھر پہنچ کر وہ رنگوں کی دنیا میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ بھگوان نے اس کی سن لی۔ اب وہ انعامی مقابلہ میں اپنا شاہکار پیش کرے گا۔ اور دُنیا اس کے آرٹ کا لوہا مان لے گی''۔

وہ رنگ اور برش لے کر کینوس پر خاکے اُبھارنے لگا۔ اس نے کئی خاکے بنائے، کئی ادھورے چھوڑ دیئے۔

اس نے کئی دن اور کئی راتیں ایک اچھوتے تخیل کو کینواس پر اتارنے میں صرف کر دیں۔ ماں کہتی ''بیٹا! تو کس خیال میں ڈوب گیا۔ پہلے روٹی تو کھالے، پھر بنانا تصوریں۔ آج تک تمہاری تصویروں نے کیا دے دیا تمہیں جواب دیں گی۔''

''ماں...............مجھے بھوک نہیں''۔

''بھوک نہیں۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ذرا اپنی صورت تو دیکھ آئینہ میں، اور تو کہتا ہے بھوک نہیں۔''

''ماں......مجھے تنگ نہ کرو.........!!''

اور وہ برش چلاتا رہا۔ دن گزر گیا۔ رات آئی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے گھرے ہوتے گئے۔ پھر صبح ہوئی۔ پھر شام چہرے کا رنگ زرد پڑتا گیا۔ نظر دھندلانے لگی، پھر

صبح، پھر شام اور اس نے اپنی تصویر مکمل کر لی۔

کینواس پر پردہ گرا دیا گیا۔

"ماں، دعا مانگ۔ تیرا بیٹا زندگی کے مقابلے میں کامیاب ہو۔"

اور ماں نے شفقت بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ "جگ جگ جیو میرے بیٹے۔"

گورنمنٹ آرٹ ایمپوریم جگمگا رہا تھا۔ آرٹسٹ چہک رہے تھے۔ نفیس اور بڑھیا سوٹوں میں ملبوس، بالوں کو ترتیب سے سنوارے ہوئے اور .... پال جس نے کھدر کا میلا سا کُرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور اُوپر کھدر کی جیکٹ، سر کے بال بکھرے ہوئے اور پریشان، بڑھی ہوئی شیو، آنکھیں ویران اور چہرہ زرد، جیسے ہلدی............

پال کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔

پھبتیاں کسی جا رہی تھیں۔

"یہ آرٹسٹ.......... یہ منہ اور مسور کی دال"

قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

"یہ آرٹسٹ... پاگل.......... ننگا..... اس کا آرٹ..... آہاہاہا۔"

اور پال تماشا بنا ہوا چپ چاپ اپنی تصویر کے پاس بیٹھا رہا۔ مگر اس کا دل دھڑکتا رہا ......پھر ڈوبنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

اس کی تصویر کا نمبر آ چکا تھا.......... پردہ اُٹھایا گیا.......... ہال میں سناٹا چھا گیا۔ قہقہے رک گئے، ہنسی معدوم ہو گئی۔ نفیس اور بڑھیا سوٹ ماند پڑ گئے۔ جیسے سب کو سانپ سُونگھ گیا ہو۔

پال کی تصویر سیاہ اور تاریک رات۔ ایک جھونپڑی، تصویروں پر گرد جمی ہوئی۔ ٹمٹماتا ہوا دیپک، کینواس پر سگریٹ کا دھواں اور نیم جاں آرٹسٹ۔ بکھرے ہوئے رنگ، سُوکھے برش اور لاٹھی ٹیکے ہوئے ایک بوڑھیا......"

تمام آرٹسٹوں کی تصویریں ماند پڑ گئیں۔ اور سبھوں کے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ اور ایک دوسرے کا تعجب سے منہ دیکھنے لگے۔ اور پال کی نظریں اپنی تصویر کی طرف لگی ہوئی تھیں اور سگریٹ جل کر اُنگلیوں تک پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

تیج بہادر بھان

جہلم کے سینے پر

چار گھنٹے...... کتنے طویل تھے یہ چار گھنٹے...... زندگی کے کٹھن چار برسوں سے بھی زیادہ طویل اور رزاق ان چار گھنٹوں میں خوف سے کانپتا ہی رہا...... تھرتھراتا ہی رہا۔

اس نے زونی سے کئی دفعہ پوچھا۔ پر زونی ہر بار انکار میں سر ہلاتی رہی۔ اس کی چھاتی پر پتھر پٹکتی رہی۔

زونی کشتی کے پچھلے سرے پر مسکراتی رہی۔ رزاق کو چڑسی ہونے لگی اس مسکراہٹ سے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مسکراہٹ نہیں، دھوکا ہے، فریب ہے۔ افوہ...... ان چار گھنٹوں میں اس نے کیا کچھ نہ سوچنا چاہا...... سمجھنا چاہا...... پر کیا...... اسے معلوم نہ تھا۔ وہ صرف خوف کی...... خوشی کی لہروں میں ڈوبتا رہا، ابھرتا رہا۔

زونی شاید غلط سمجھ رہی تھی اس کو خود غرض تصور کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی تو بے وقت شہر جا رہا تھا۔ پر وہ زونی کو کیسے بتاتا، کیونکر سمجھتا کہ اسے ڈر ہے...... خوف ہے...... اسکی نگاہیں مٹیالے رواں پانی سے اٹھ کر زونی کی جانب بار بار مڑتی رہیں۔ بہت سکون ملتا تھا اس کو جب زونی چپو سے کھیلتے ہوئے اس کی طرف شرمیلی نگاہوں سے جھانکتی اور نگاہوں میں تھوڑی سی حیا...... تھوڑا سا غرور جھلک اُٹھتا۔ پھر بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ زونی اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ مسکراہٹ کی آڑ میں...... آنسوؤں کا...... آہوں کا دم گھونٹ رہی ہے۔ محسوس ہوتے ہی اس کا ذہنی انتشار بڑھ سا جاتا تھا اور کندھے سے لگا ڈانڈ اور زور سے کندھے میں چبھنے لگتا۔

سامنے پُل صاف نظر آ رہا تھا۔ دیو ہیکل لاش کی طرح پھیلا پل، موت کی پرچھائیاں نیچے بہتے ہوئے پانی کی تیز دھاروں پر ڈال رہا تھا، جیسے رواں زندگی پر بندھ باندھ رہا ہو۔ پر پانی بہتا جا رہا تھا اور بہتے پانی کا شور بھی سنائی پڑتا تھا۔ جھاگ سطح پر چکر کھا کھا کر چھوٹے بھنوروں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔

پانی کا شور رزاقؔ کے کانوں میں سرگوشی سی کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کھچ گیا۔ آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی، جیسے سرگوشی سے آنے والے خطروں سے آگاہ کرنے لگی۔ کشتیوں کے تختوں کے ٹوٹنے کی آواز کا پتہ دینے لگی اور وہ جھنجھلا کر کوسنے لگا۔ ''آگ لگ جائے اس دریا کو...... کبھی اُتار پر ہے تو کبھی چھڑاؤ پر...... میں تو......'' وہ رک گیا۔ شاید زونیؔ کراہ رہی تھی یا شاید کشتی پانی کے دباؤ سے کراہنے لگی تھی...... اس کے کان دھوکا تو نہیں کھا گئے۔ وہ اپنی ہراسانی پر قابو پانے کے لئے زونیؔ کو تکنے لگا۔ زونیؔ کھڑی چپو لئے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زونیؔ بظاہر پانی کی طرف دیکھ رہی تھی پر اسکی آنکھیں کچھ نہ دیکھ پاتی تھیں۔ وقتی درد کی لہر نے اس کی نگاہوں کو دھندلا کر دیا۔ وہ بے حس کھڑی...... اینٹھ سی گئی۔ ٹانگیں اکڑ رہی تھیں۔ ہونٹ دانتوں تلے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور انگلیوں کی گرفت چپو پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے درد پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ پیٹ پر جیسے کوئی تول تول کے مکے مار تھا۔ سانس گھٹتا سا محسوس ہوا۔ غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے ہلکی چیخ دانتوں میں سے پھسل سی گئی اور وہ گھبرا کر رزاقؔ کو دیکھنے لگی۔ آنسوں سے لبریز آنکھوں کو رزاقؔ ڈانڈ جھکا ٹیڑھا میڑھا دکھائی دیا اور زونیؔ کے سینے سے جیسے بھاری بوجھ سرک گیا۔

رزاقؔ اگر چیخ سن پاتا۔ تو شاید ڈانڈ پھینک کر اس کی طرف لپکتا...... اور کشتی بے قابو ہو کر کنارے سے ٹکرا جاتی۔ اس لئے تو زونیؔ تکلیف کے باوجود چپو تھامے رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دبائے...... اتنا دبائے...... اتنا دبائے کہ کمر سے چپک جائے...... پر کیسے......؟ وہ چپو تو نہیں چھوڑ سکتی تھی...... پتوار بغیر کشتی کنارے کیسے لگتی......؟

زونیؔ کو چپو پکڑے دریا کو گھورتے دیکھ کر رزاقؔ کی ڈھارس ذرا بندھ گئی۔ پھر بھی سینے پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا جیسے ساری کشتی کا وزن اس کے سینے پر لہرا رہا تھا۔ دکھ سے بوجھل اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ کل دن اور آج دن میں کتنا فرق تھا۔ کل بھی زونیؔ مسکرا رہی تھی پر اس مسکراہٹ میں کتنی امید تھی...... کتنی خوشی تھی۔ اور آج...... آج وہ سمجھنا نہ چاہتا تھا...... سوچنا نہ چاہتا تھا۔ پھر بھی اس پر واضح تھا کہ آج زونیؔ کی مسکراہٹ آنسوؤں میں نہائی ہوئی ہے۔ دبی چیخوں سے لبریز ہے۔ اس لئے وہ دل ہی دل میں نادم ہوا کہ کیوں شہر کی طرف روانہ ہوا...... کیوں نہ زونیؔ کو آرام کا موقع دیا...... پر کل...... کل تو اور بات تھی۔

کل دریا میں پانی زیادہ نہ تھا۔ سفر کا پہلا دن تھا۔ اس لئے کُھر درا لکڑی کا ڈانڈ نرم محسوس ہو رہا تھا اور کندھے پر ڈانڈ کا دباؤ ہلکی تھپکی۔ پانی نیلگوں تھا، زونؔی کی نیلی آنکھوں سے کتنا مُشابہ...... جیسے زونؔی کی نیلی آنکھوں کی پرچھائیں سارے دریا پر چھائی ہوئی تھی۔ اور لہریں نیلگوں پانی پر سورج کی شعاؤں سے چاندی کی گوٹا کناری بننے میں مصروف تھیں۔
اور کشتی دریا کی ہلکی تھپکیاں سہتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھی۔ لہروں کی چپ چپ کی میٹھی آواز پر کسی نوزائیدہ بچے کے دودھ چوسنے کی آواز کا گمان ہوتا تھا۔ وہ بجری سے بھری کشتی اکیلے کھے رہا تھا۔ اور زونؔی پچھلے سرے پر کھڑے چپو سے پتوار کا کام لے رہی تھی۔ ہوا کے گرم جھونکے زونؔی کے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ہلکے سُرخ گالوں سے بال ہٹاتے وقت زونؔی کتنی بھلی لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ لہروں کی لئے سے لئے ملاتے ہوئے گنگنا بھی اٹھتی تھی۔ زونی کی باتیں...... حرکتیں...... قہقہے شوخ ہوتے جا رہے تھے۔ اور اسے محسوس ہوا تھا کہ زونؔی کی طبیعت خراب ہونے والی ہے۔ زونی کی باتیں...... حرکتیں اسے پریشان کرنے لگیں۔ آخر گاؤں کی بوڑھی دایہ کا اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔ اور زونؔی کا پیٹ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے پھرن کے باوجود اُبھار صاف نمایاں تھا۔ لیکن زونی اسکی فکر سے بے نیاز چپو تھامے خاموش کھیتوں کو تک رہی تھی۔ کھیتوں سے پرے دُور نیلے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رزاقؔ کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ پہاڑ اس کے ارد گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ مہیب دیوزادوں کی طرح خاموشی سے اس کی بربادی کے منتظر ہیں۔ خاموشی اس کے کانوں پر بوجھ بن کر چھانے لگی۔ اور اس دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ شہر جلدی پہنچ جائے......
رزاق شہر کسی حالت میں نہ آتا۔ گو ٹھیکیدار کو بجری کی بڑی ضرورت تھی۔ پر اسے آنا پڑا چاول ختم ہونے لگے تھے۔ پیسہ کوئی پاس تھا نہیں اور دن گزرتے جا رہے تھے۔ ایسے میں اسے کچھ نہیں سُوجھا، سوائے شہر آنے کے۔ اس نے سوچا کہ شہر پہنچ کر ٹھیکیدار سے پیسے بھی لے لوں گا اور کسی ڈاکٹر سے زونؔی کا ملاحظہ بھی کراؤں گا۔ شہر میں خیراتی دواخانہ بھی تھے اور دو چار روپے خرچ بھی ہو جاتے تو...... اور اس نے زونؔی سے پوچھا تھا۔
"کیا خیال ہے تمہارا...... شہر چلیں۔
"ہاں ہاں...... دیکھو چاول بھی ختم ہو رہے ہیں...... وہاں ٹھیکیدار سے کچھ روپے

تو ملیں گے۔'' زونی نے پیٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا تھا۔
''تمہاری حالت غیر یقینی ہے، پتوار پکڑ سکے گی۔'' وہ خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا۔
''میں اچھی بھلی تو ہوں''۔ زونی نے جواب دیا تھا۔ لیکن اسکی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ جانا تو چاہتا تھا، پر ڈر تھا کہ کہیں زونی کو راستے میں تکلیف نہ ہو۔ اس امید پر کہ زونی شاید انکار کر دیئے، وہ کہنے لگا۔ ''دو دن لگیں گے شہر پہنچے ہیں...... اور مزدور بھی نہیں لے سکو گا کرایے پر...... کشتی اکیلے ہی لے جانی پڑے گی۔''
''میں دو دن میں مر نہیں جاؤں گی۔'' زونی غصے سے بولی۔ وہ چاہتی تھی کہ رزاق کسی طور شہر چلا جائے۔ کیونکہ چاول ختم ہو رہے تھے اور امید بر آنے پر برادری کے دو چار آدمیوں کو بلانا ضروری تھا۔ اسکی اپنی دو چار سہیلیاں بھی تو منتظر تھیں اور رزاق نے بالآخر کشتی کا رخ شہر کی طرف پھیر ہی دیا تھا۔
پل نزدیک آ رہا تھا اور کشتی کے ہچکولوں میں تیزی آ رہی تھی۔ بجری کے وزن سے کشتی بہت بھاری ہو گئی تھی۔ اور کشتی کو چالو رکھنے کے لئے رزاق کو بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ بازوؤں اور گردن کی رگیں بُری طرح ابھر آئی تھیں۔ اپنا پورا زور لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ پل کے پار اسے کشتی ضرور روکنی چاہیئے۔ زونی بے چاری لگاتار چار گھنٹے چپو تھامے کھڑی رہی ہے اور کل بھی دن بھر کھڑی رہی۔
کل بھی دن بھر زونی چپو تھامے کھڑی رہی تھی۔ دن کو زیادہ تکلیف نہ ہوئی تھی پر رات کو......! وہ اگر رزاق کو گمان بھی ہوتا تھا تو وہ کسی حالت میں اپنا سفر جاری نہ رکھتا۔ دن بھر کی تھکان سے ادھ موا ہو کر وہ گہری نیند میں غافل ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ زونی کی آہیں نہ سن سکا...... کراہنا نہ سن سکا۔ زونی کی آنکھوں سے آنسوں ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ درد کی زیادتی سے مجبور ہو کر اس نے کئی بار سر پٹک دیا تھا۔ کئی بار منہ میں کپڑا ٹھونسا تھا بغیر ملاح کے کشتی کی طرح، جو تند و تیز طوفان میں گھری ہو، وہ رات بھر درد کے تھپیڑے کھاتی رہی...... ڈوبتی رہی...... ابھرتی رہی۔ پر اس نے رزاق کو جگایا نہیں...... وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی تو نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے...... کیا ہو گا......؟
اور صبح جاگتے ہی جب رزاق کی نظر زونی کے چہرے پر پڑی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ ایک رات کے وقفے میں ہی زونی کتنی بدل گئی تھی۔ چہرہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے

گرد کالے حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ ہونٹوں پر پیڑیاں جم گئی تھیں۔ زونی کو اس حالت میں پا کر وہ شرمندہ سا ہو گیا تھا اور ہکلاتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ ''تم کتنی سپید نظر آ رہی ہو......'' پر زونی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''نہیں تو...... وہم ہے تمہارا......'' اور وہ اٹھ کر چائے بنانے لگی تھی۔

زونی کی مسکراہٹ اسے فریب نہ دے سکی۔ مسکراہٹ میں کچھ مردنی تھی...... کچھ روکھاپن تھا......وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ مردنی کیا ہے......روکھاپن کیا ہے۔ پر کچھ ضرور تھا۔ اس باس کی طرح جو حد سے زیادہ پکے ہوئے پھل میں پیدا ہوتی ہے یا اس بُو کی طرح جو بہت دیر تک پانی میں ڈوبی کشتی میں پیدا ہوتی ہے۔

زونی اور وہ......دونوں کے لئے یہ تجربہ نیا تھا...... پہلا......اس لئے وہ دونوں حیران تھے...... پریشان تھے۔ وہ جانتے نہ تھے کہ آنے والے واقعات کا کس طرح سے سامنا کریں......ایک دم ہی تو سب کچھ ہو گیا تھا۔ انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ حالات ایسے پلٹا کھائیں گے۔ انہیں پیٹ کے دھندوں سے فرصت ہی کب ملی تھی یہ چیزیں سوچنے کے لئے......سمجھنے کے لئے......اور اب......کچھ خوف تھا کچھ خوشی تھی۔

رزاق سے اب سہا نہ جاتا تھا۔ ان چار گھنٹوں میں اس نے بہت دفعہ زونی کی طرف دیکھنا چاہا...... بار ہا دلاسہ دینا چاہا......تاکہ آنے والی اذیت کو کم کرنے میں مدد دے......لیکن کوشش کے باوجود پلکیں نہ اٹھتی تھیں......زبان کہنے سے قاصر تھی...... کہتے ہی کوئی خوفناک خیال اس کے حلق میں اٹک سا جاتا تھا۔ اور زونی......

درد کی لہر جب کبھی اٹھتی تھی تو وہ بے بس سی ہو جاتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا......جیسے کوئی اس کے پیٹ کو چیر رہا ہے...... کُند چھری سے ہلکے ہلکے...... اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگتا......پُل کے شہتیر رینگتے نظر آتے......اور ابلتا مٹیالا پانی تیزی سے بدن کو جھلسانے لگتا۔ عجیب درد تھا...... یہ زخم دیکھا نہ جاتا تھا۔ پر پھر بھی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پر تلخی کے باوجود اسے کچھ روحانی خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ چھاتیوں میں کچھ کسک سی پیدا ہو رہی تھی۔ بہت دن پہلے سے اس نے یہ کسک محسوس کی تھی اور اس نے بہت دفعہ چھاتیوں کو ٹٹولا بھی تھا...... کچھ بھی تو نہیں تھا، صرف پیٹ کے ساتھ ساتھ وہ بھی اُبھر رہی تھیں۔ پیٹ پر تناؤ آ گیا تھا......کتنا بھدا لگ رہا تھا پیٹ...!

چار گھنٹے برداشت کرتے کرتے رزاق بوکھلا سا گیا۔ اور اب ڈانڈ کے سہارے جھکا۔ وہ خدا کو کوسنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ خدا نے صرف عورت ہی کو درد سہنے کے لئے کیوں پیدا کیا...... جب قصور دونوں کا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ صرف ذہن میں الجھے خیالات کا ایک ہنگامہ تھا۔ جسے سلجھانے میں وہ ناکام ہو رہا تھا۔ یکایک وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ زونی بہت درد محسوس کر رہی ہے اسے یقین نہ تھا۔ یہ خیال شاید یوں ہی آ گیا، پر زونی کے چہرے پر درد کا کچھ اثر ضرور تھا۔ زونی کے ہونٹوں کا کچھاؤ...... چپو پر انگلیوں کی گرفت...... کتنی سختی سے چپکی تھی۔ اُنگلیاں چپو سے...... جیسے لکڑی میں گھس جانا چاہتی تھی۔ رزاق سے رہا نہ گیا۔ وہ پوچھ بیٹھا۔ ”زونی ٹھیک تو ہو؟“ زونی صرف سر ہلا سکی۔

پانی کا شور گرج میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جھاگ سطح پر چکر کھاتے کھاتے کشتی کے کناروں کا سہارا لینے لگی تھی۔ اور کشتی ہولے ہولے پانی کو چیرتے ہوئے کراہ رہی تھی۔ وہ زونی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ زونی کو سہارا دینا چاہتا تھا...... پر کیسے......؟ وہ ڈانڈ تو چھوڑ تو نہیں سکتا تھا۔ کشتی ڈانڈ کے سہارے ہی تو بہاؤ کے آگے کھڑی تھی۔ اور بہاؤ پورے زور سے موڑ کے اونچے کنارے سے ٹکرا رہا تھا۔ کنارے کی مٹی گھل گھل کر مٹیالے پانی کے زنگ میں گہرائی کی لکیریں پیدا کر رہی تھی۔ موڑ سے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں چمگادڑوں کی طرح چمٹی پڑی تھیں۔

معاً اسے خیال آیا کہ کیوں نہ کشتی کو بہاؤ پر چھوڑ کے کہیں نیچے روک لے...... پر کہاں......؟ بہت دُور تک تو دریا کے کنارے عموداً کھڑے تھے۔ پانی کی سطح سے کچھ دو فٹ اوپر تک مٹی بہاؤ کے زور سے کھرچ کھرچ کے بہہ گئی تھی اور اوپر والی سطح پانی پر مونڈوں کی صورت میں باہر اُبھر آئی تھی۔ اوپر والی سطح کے سایے خوفناک طریقے پر دریا پر تھرتھرا رہے تھے۔ مونڈوں سے درختوں کی جڑیں پھانسی کی رسیوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اگر دور تک کشتی کو بہنے دے تو بعد میں کشتی پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اتنی بھاری کشتی ایک دفعہ بے قابو ہو جائے تو گولی کی طرح کنارے سے ٹکرا جائے گی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ پر زونی کو مدد کی ضرورت تھی۔...... سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ پیلی پڑتی جا رہی تھی۔ چہرہ خوفناک لکیروں میں کھچا جا رہا تھا۔ آنکھیں بری طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ رزاق اور کچھ نہ دیکھ سکا اسے محسوس ہوا کہ جیسے ساری دنیا اس

کی بربادی کی منتظر بیٹھی ہے۔...... یہ اونچے کنارے، جن کی طرف دیکھ کر ذہن میں خواہ مخواہ ڈراؤنے خیالات رینگنے لگتے ہیں، یہ مٹیالا پانی ...... جیسے کوئی لمبی لاش بہی جاری ہے...... یہ بجبری سے بھری کشتی اور کندھے سے لگا ڈانڈ بھی، جس نے اس کے ہاتھوں میں چھالے ڈال دئے تھے۔ وہ اور کچھ نہ سہہ سکا۔ اس کے بدن میں سوئیاں سی چُبھنے لگیں۔ اور سمٹی سمٹائی قمیض کی موٹائی کے باوجود اسے کندھے پر ڈانڈ کی چبھن بری طرح محسوس ہوئی۔

درد کے جھٹکے زونی کو کبھی دُہرا کر رہے تھے۔ اور کبھی ڈانڈ کی طرح سیدھا...... وہ کانپ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ پر پُل ابھی دور تھا۔ چند ہی گز...... لیکن پھر بھی کتنا دور...... درد کی شدت کے باوجود اس نے چپو کو اور زور سے تھاما...... پر کب تک......؟ ابھی اس کے حواس باختہ نہیں ہوئے تھے۔ ابھی اس کی انگلیوں کی سکت ختم نہیں ہوئی تھی۔

''وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا...... کمینہ...... بے درد...... میں مر رہی ہوں...... اوہ......''

اسکی زبان تالو سے لگنے لگی۔ ہونٹ مرجھا اٹھے۔ حلق تیزی سے سوکھ رہا تھا.. پر تر کیسے کرے؟ ...... چپو پر جھکے جھکے اس نے آنکھیں زبردستی کھول لیں.. سامنے مٹیالا پانی...... ناچتا پانی...... کتنی تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ صرف کچھ فٹ کے فاصلہ پر...... ہنستا کھیلتا پانی بہا جا رہا تھا۔ ہاتھ ذرا سا بڑھانا تھا۔ ذرا سا جھکانا تھا اور سوکھا حلق...... وہ کیسے جھکے؟ کیونکر ہاتھ بڑھائے؟.. وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ جھک کر وہ پھر نہ اُٹھ سکے گی۔ اور چپو تھامے رکھنا تھا۔ ''اوہ...... وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا...... وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا...؟ زونی کراہانے لگی۔ زونی کا چپو دُہرا ہوتے دیکھ کر رزاق کے پاؤوں تلے بجری پھسلنے لگی۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ زونی یکایک اتنی سخت اذیت میں مبتلا ہوگئی۔ خوف کے زیر اثر اس نے زونی کو جگانا چاہا...... جھنجھوڑنا چاہا۔ پر آواز حلق میں ہی گھٹ کر ہی رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی ہتھوڑوں سے اس کا بھیجا توڑ رہا ہے۔ بدن میں گانٹھیں پڑ رہی ہیں۔ تلووؤں میں بجری کے چھوٹے چھوٹے دانے نہیں بلکہ نشتر چبھ رہے ہے۔ اس کا ذہن سُن سا ہو گیا ہے۔ بے وقوفوں کی طرح اسے خیال آیا۔ ''زونی کہتی ہے لڑکا ہوگا...... میں کہتا ہوں لڑکی...... مجھے یقین ہے کہ لڑکی ہوگی۔ خوبصورت سی پیاری لڑکی...... جس کے بال زونی جیسے

لاحول ولا قوۃ...... آگ لگ جائے بالوں کو......وہ دفعتاً اپنی سراسیمگی پر پریشان ہو گیا۔ اور غصے میں آکر بڑبڑانے لگا۔ ''میں باولا تو نہیں......زونی میری خاطر...... کشتی کی خاطر اتنی تکلیف سہہ رہی ہے اور میں ہوں کہ......اس نے زونی کا پھر سے جائزہ لیا۔ وہ برداشت نہ کر سکا ذہنی اور جسمانی کش مکش میں اس کا بدن ٹوٹتا جارہا تھا۔ وہ نجات پانا چاہتا تھا۔ صرف ایک سے...... چند لمحوں کے واسطے......مگر کیسے؟......اس نے سہنا تھا۔ زونی کے ساتھ ساتھ تکلیف برداشت کرنی ہی تھی۔ پر اسے جلدی کرنا چاہئے......زونی شاید اور سہہ نہ سکے۔ اور پُل تو ابھی دور ہے۔ ایک تیز چوٹ کی طرح پل اور کشتی کا فاصلہ اس پر واضح ہوگیا۔ اور اس کے چہرے پر پھوٹتے پسینے میں آنسوں کی نمی بھی جذب ہونے لگی۔

رزاق اپنے کندھے کا درد بھول گیا۔ اب وہ لکڑی کی طرح سخت......کھردارا......ڈانڈ کا ایک حصہ بن گیا۔ اور کوئی نامعلوم طاقت اس پر بے انتہا زور صرف کرنے لگی۔ کشتی کی حرکت میں نئی تیزی آگئی۔ پانی اور کشتی کے ٹکراؤ کی گرج اوپر تک پہنچ گئی۔

کتنی پھرتی آگئی اس کے تھکے جسم میں..جیسے پانی کے بہاؤ کا سارا زور اس میں سما گیا ہو۔ اور ڈانڈ کتنی تیزی سے پانی میں ڈوبتا جارہا تھا۔ جیسے یہ ڈوبتا ہی جائے گا......جیسے اس دریا کی تہہ ہی نہیں...... پر نہیں...... آخر ڈانڈ تہہ سے ٹکرا ہی گیا۔ اور کشتی جھٹکے سے پانی کا مقابلہ کرنے لگی۔ اس نے زونی کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لئے......ایک لمحہ بھی کتنا لمبا محسوس ہوتا ہے۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بزدل بنتا جارہا ہے۔ پر اس وقت وہ جان بوجھ کر بزدل بننا چاہتا تھا۔ افوہ......کس قدر خوفناک ......کس قدر ڈراؤنا تھا یہ ایک لمحہ......!موت کی ساری طاقتیں لئے یہ ایک لمحہ اس کے بدن کو چیرتا جارہا تھا۔ وہ عمر بھر اس لمحہ کو بھول نہ سکے گا۔ راتوں کو کشتی کے کھردرے تختوں پر وہ ڈراؤنے خواب دیکھا کریگا۔......زونی درد کے مارے دُہری ہوئی جارہی تھی۔ چپو پر پھسلتے پھسلتے وہ ناؤ کے کنارے سے آلگی۔ چپو انگلیوں سے پھسل رہا ہے اور کشتی پتوار بغیر ٹیڑھی ہو رہی پانی کی تیزی میں کشتی تنکے کی طرح چکر کھاتی ہوئی سامنے موڑ کے کالے اونچے کنارے کی طرف بڑھی جارہی ہے......اتنی تیزی سے......اس کے سر میں چکر سا آگیا۔ بدن اکڑا ہوا...... پٹھے تنے ہوئے ......سر اٹھا ہوا۔ آنکھیں بند، وہ آنے والے جھٹکے کا انتظار کرنے لگے۔ کندھے پر بدستور دباؤ بڑھتا جارہا تھا بے انتہا دباؤ......جیسے کوئی کیل

ٹھوک رہا ہو۔ پر کشتی بڑھتی جا رہی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

کشتی پل کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ پل اور کشتی کا درمیانی فاصلہ یقیناً کم ہوتا جا رہا تھا، اب پل کا سایا بھی کشتی کو چھونے کو لگا۔...... کشتی پر دباؤ بڑھنے لگا۔ بہتے پانی کا شور دھاڑ میں منتقل ہو رہا تھا۔ اور رزاق اپنے جوان جسم کا سارا زور...... سارا نچوڑ ڈانڈ پر صرف کرنے لگا۔ کشتی تیز ہچکولے کھاتی ہوئی پل کے نیچے آ گئی۔ اور سامنے کچھ گز کے فاصلہ پر ایک اور ٹھہری کشتی کا سرا...... وہ مدد کے لئے کیوں نہیں پکار رہا ہے...... کیوں نہیں چلا رہا ہے.؟ پر کیا فائدہ......؟ دوسری کشتی میں تو کوئی نہیں تھا۔ صرف لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر...... کاٹھ کے پتلے جو ہل تو نہیں سکتے تھے۔ پر دیکھ سکتے تھے۔ اس کی بُربادی کے منتظر تھے۔ خاموش اژدہوں کی طرح غائبانہ اس کی بے کسی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ کاش وہ سرا ہاتھ آئے! صرف ایک دفعہ اس کی انگلیاں اس دوسری کشتی کے سرے میں کُھب جائے ...... اس کا گلا بری طرح سے خشک ہو گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گلے میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور ان میں سے خون بہہ رہا ہے نمکین خون...... اس نے بائیں ہاتھ سے منہ پونچھا.. ہونٹ دانتوں تلے آ کر کٹ گیا تھا اور تھوڑا سا لال نمکین خون ٹھڈی پر بہہ آیا تھا۔

زونؔی کشتی کے کنارے بے بس دوہری پڑی تھی۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے...... کیوں ہو رہا ہے؟ صرف پیٹ کے نچلے حصے میں آگ سی دہک رہی تھی جو اسے بری طرح جلائے جا رہی تھی۔ وہ چپو سے سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بری طرح سے سرایت کر گیا کہ یہ چپو ہی اسے اس اذنیت سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس کی انگلیاں چپو میں گھس جانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن یہ آگ...... یہ تپش کیوں کم نہیں ہوتی؟ اوہ...... یہ لال لال شعلے...... خوف ناک دہکتے انگارے...... اس کے چاروں طرف پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ چیخنے لگی۔ ٹانگیں بیدردی سے پٹکنے لگی۔ کالا دُھواں اس کا دم گھونٹ رہا تھا...... سینہ چیر رہے تھے یہ کڑوے گھونٹ اور دُھواں بڑھتا جا رہا تھا...... پھیلتا جا رہا تھا۔

رزاقؔ سے اب کچھ نہ سوچا جاتا تھا۔ اس کا سارا زور...... ساری تڑپ ڈانڈ پر صرف ہوئی جا رہی تھی۔ وہ صرف دیکھ رہا تھا۔ سمجھے بغیر دیکھ رہا تھا۔

زونی بے حِس کشتی کے کنارے دُہری پڑی ہوئی ہے۔ آنکھوں سے آنسوں بہہ بہہ کر

بجری میں جذب ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی ہلکی گلابی لہرے چہرے پر پرچھائیاں سی ڈال جاتیں اور پھر وہی سپیدی...... ہونٹوں کے کنارے بھڑک رہے تھے۔ شاید کرراہ رہی ہے۔ پر پانی کی گرج آواز کو سنائی دینے سے پہلے ہی دم گھونٹ دیتی تھی۔ رزاق کا سر دوسری کشتی کی طرف مڑا۔ بس پاس ہی تو تھی کشتی......اس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ کاش زونی چپو تھامے رہے......اس کے تھکے ذہن میں یہ آواز بار بار ٹکرا اٹھی...... ''کاش زونی چپو تھامے رہے!''

پانی کی گرج کانوں میں گونج پیدا کر رہی تھی اور وہ جھنجھلا اٹھا۔ دل کی دھک دھک ہی کیا کم پریشان کر رہی تھی۔ اس نے کانوں کو بند کرنا چاہا۔ پر ہاتھ ڈانڈ سے چمٹے پڑے تھے۔ اور ڈانڈ تیز بہاؤ میں کانپ رہا تھا۔ اس نے چلانا چاہا تاکہ پانی کی گونج کو اپنی آواز میں گم کر سکے۔ پانی کا شور اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کی بربادی پر قہقہے مار رہا تھا۔

زونی چپو نہ چھوڑنا......زونی۔ وہ پوری شدت سے چلایا۔ جیسے پانی کی تیزی کو للکارا۔ پر آواز حلق سے باہر نہ نکلنے پائے۔ کچھ ہو گیا تھا اسے......اور وہ محسوس بھی کر رہا تھا۔ وہ چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ نگاہوں کو زخمی کرنے والی نوکیلی چٹانوں سے بھرپور پہاڑ..... سسکتی آہوں کی طرح گرد کے مرغولوں سے ڈھکی ہوئی سنسان سڑک ......اس کی بربادی کی پرچھائیاں اُوڑھے ہوئے یہ خاموش کھیت......خوفناک درندوں کی طرح تاک لگائے ہوئے یہ اونچے کنارے...... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ صرف مٹیالے رنگ کا رواں سیال مادہ......مٹیالہ گہرا پانی......موت کی طرح گہرا اور زرد......اس کی آنکھیں بھی مٹیالی ہوئی جا رہی تھی اور پیر بجری پر پھسلتے جا رہے تھے۔

کوئی چیز گہرے پانی میں چمکے...... چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی چمکتی سطح......زندگی کی جھلکیاں......اس نے زونی کی طرف دیکھا۔

زونی مجسم زندگی تھی۔ اس کا سارا بدن پانی سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ٹانگیں کشتی کے کناروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ سر بجری پر زور زور سے ہل رہا تھا۔ چیخیں دریا کی گونج کو دباتے ہوئے فضا میں منڈلا رہی تھیں۔ رزاق کو محسوس ہوا کہ یہ چیخیں نہیں منڈلا رہی ہیں، گدھ منڈلا رہے ہے۔ چپو زونی کی کانپتی انگلیوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے پھسلا جا رہا ہے۔

گھبرا کر اس نے مڑ کر دوسری کشتی کی طرف دیکھا۔ دوسری کشتی کا سرا بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ کسی نامعلوم قوت کے زیر اثر وہ لپکا۔ اسکی تھکی انگلیاں دوسری کشتی کے سرے سے ٹکرا گئیں اور پھسلنے لگیں۔ انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ دوسری کشتی کے سرے پر ناخن لکڑی چھیلتے جا رہے تھے اور اس کا بدن کھچتا جا رہا تھا۔ اسے بے انتہا ٹھنڈا محسوس ہوئی...... نوکیلی جو دل میں تیز چاقو کی طرح اترتی جا رہی تھی۔ بدن پر کیڑے رینگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ دفعتاً اُس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ ٹانگوں میں جھٹکا سا محسوس ہوا۔

چشم زدن میں اس نے دونوں کشتیوں کے سروں کو باندھ دیا۔

رزاق مڈا اور مڑا ہی رہا ....

زونی کا بے حس سر کشتی سے بجری پر دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ بایاں ہاتھ کشتی کے کنارے سے چمٹا پڑا تھا۔ اور داہنے ہاتھ کی مٹھی میں گول گول بجری بھینچتی ہوئی تھی۔ ٹانگیں بری طرح پھیلی ہوئی تھیں، چہرے پر آنسو کے ننھے ننھے قطرے دُھوپ میں چمک رہے تھے اور چپو دور...... مردہ کالے سانپ کی طرح بہہ رہا تھا اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا سارا دماغ جیسے ماؤف ہو گیا۔ صرف سر میں درد بڑھتا جا رہا تھا اور وہ بیوقوفوں کی طرح کھڑا منہ کھولے زونی کو دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً اس نے پھریری لی۔ زونی شاید انگلیاں ہلا رہی تھی۔ سر میں درد شام کے اندھیرے کی طرح گہرا ہو گیا۔ تیزی سے گہرا ہونے لگا اور وہ اپنے آپ سے بھاگنے کے لئے اندھا دُھند بجری پر بھاگتا ہوا زونی کے پاس پہنچا۔

زونی کے حلق سے عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں، جیسے جھنجھنا بج رہا ہو۔ اور اس کے تضاد سے پانی کا شور اونچا ہوتا سنائی دیا۔ جیسے اپنی ناکامی پر نالہ وشیون کر رہا ہو۔ اور پھرن کے نیچے کچھ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے اس نے پھرن کا دامن ہٹایا۔

زونی کی سپید رانیں خون میں نہائی ہوئی تھی۔ لال لال خون ...... جس میں سے دُھواں سا اٹھ رہا تھا۔ کشتی کے تختوں پر بہتے ہوئے بجری کے بڑھتے ڈھیر میں گم ہو رہا تھا۔ اور ٹانگوں کے بیچ ایک ننھی سی جان متحرک تھی۔ رزاق کو کچھ خوشی محسوس نہ ہوئی۔ یہی تو سب تکلیف ...... فکر ...... ڈر ...... کی جڑ تھا۔ پھر بھی وہ اس گوشت کے لوتھڑے کی حرکت دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ ننھی ننھی ٹانگیں ہوا میں سٹپٹا رہی تھی۔ اور ننھے ننھے بازو زونی کی

ٹانگوں کو دھکیلنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

کراہنے کی آواز سن کر اس نے زونی کی طرف نگاہیں پھیر لی۔ کتنا سپید تھا زونی کا چہرہ...... برف سے بھی زیادہ سپید...... زونی کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔ ہونٹ دھیرے دھیرے پھڑ پھڑا اٹھے۔ اس نے زونی کے منہ کے قریب کان لگائے وہ کہہ رہی تھی۔

''جلدی کرو...... نال کاٹ کر کپڑے سے باندھ دو...... جلدی......'' اور وہ بے سدھ ہوگئی۔ گھبرا کے اس نے لرزتے ہاتھوں سے قمیض کو پھاڑ ڈالا۔ نال کو کاٹتے ہوئے بچہ زور سے چیخ پڑا۔ اور وہ ڈر گیا۔ اس نے زونی کی طرف دیکھا۔ زونی کا چہرا درد کی شدت کا آئینہ دار تھا۔ اپنی آنکھوں سے آنسوں کو پونچھتے ہوئے وہ خون میں لتھڑے ہوئے سرے کو قمیض کے ٹکڑے سے کس کر باندھنے لگا۔

☆☆☆

حامدی کاشمیری

سَپنوں کے گھاؤ

بنڈ روڈ کی اُونچائی سے سڑک سیدھی نیچے کو جاتی ہے اور شاہی باغ کی طرف مُڑتی ہے۔ اس سڑک پر چلتے چلتے اچانک میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سڑک پر بھاگتے ہوئے لوگ موہوم سایوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور متحرک سایوں کی اس بھیڑ میں وہ میرے پاس سے گذرتی ہے۔ لمحہ بھر کو ہماری آنکھیں مل جاتی ہیں۔ اور مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ اُس کے چہرے پر مانوسیت کی روشنی ہے اور ہونٹوں پر ایک دبی سی غیر واضح مُسکراہٹ! اور میں دل میں ارمانوں اور خواہشوں کا گلا دبا کے جسم کی لاش کو گھسیٹتا ہوا دفتر کی راہ لیتا ہوں۔

ٹیبل پر فائلوں کی کالی دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔ سپرانٹنڈنٹ داس جی کا بھیانک چہرہ دیوار کے اُس پار تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ میرا روز کا معمول ہے۔

تین سال گذر گئے۔

تین سال سے بنڈ روڈ کی اُس نشیبی سڑک سے گزرتے ہوئے میری یہی حالت ہو جاتی ہے۔ میری اس جذباتی کیفیت کا کیا ہے یہ مجھے خود معلوم نہیں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ زندگی کے روز و شب کے ویرانوں میں چند لمحے کے لئے دُور دُور تک برکھا ہو جاتی ہے۔ روز میں پونے دس بجے گھر سے نکلتا ہوں۔ ریڈیو سے آخری فرمائشی گیت نشر ہو رہا ہے۔ میں بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل پڑتا ہوں۔ کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر! رضیہ کچن سے چیخ رہی ہے۔ بس ایک منٹ میں آ رہی ہوں۔ لیکن اس ایک منٹ کی اہمیت کوئی مجھ سے پُوچھے۔ بے چاری رضیہ کو کیا معلوم میں اُس سے بات کئے بغیر نکل آتا ہوں اور سیدھا بنڈ روڈ پر پہنچتا ہوں اور بنڈ روڈ کی نشیبی سڑک سے گزرتے ہوئے میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ میرے پاس سے گزرتی ہے۔

لیکن آج میرے خُدا اس کالی دیوار میں کوئی سوراخ بھی نہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور کسی موج ہوا کا گزر بھی نہیں۔ میرا ہاتھ پیڈ پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ دُھند چھٹ رہی ہے۔ بس سٹینڈ پر لوگوں کی بھیڑ تھی، دُھوپ تیز تھی اور انتظار کی گھڑیاں دل میں تھکن اور بیزاری پیدا کر رہی تھیں۔ ٹکٹ میں لے چُکا تھا اور اب بس کا انتظار تھا۔ پتہ نہیں بس کیوں لیٹ ہو رہی ہے۔ دو گھنٹوں کا طویل اور اُکتا دینے والا سفر ہے۔ کیسے کٹے گا یہ سفر؟ اور پھر اتنا غیر رومانی سفر! مردوں کے اس بے ہنگم ہجوم میں صرف دو بوڑھی عورتیں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔ اور جماہیوں پر جماہیاں لے رہی ہیں۔ میری نظر شکنوں کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں وہ سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔

''آپ؟ یہاں کہاں؟'' اُس کی سیاہ چمکتی ہوئی مانوس آنکھوں نے مجھے بولنے کی ہمت عطا کی۔

''یہی بات میں آپ سے پُوچھنے آئی ہوں'' اُس نے بڑی بے تکلفی سے جواب دیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اس عورت کو برسوں سے جانتا ہوں۔ ہم بار بار ملے ہیں۔ باتیں کر چکے ہیں اور۔ ''میں آفس کے کام سے شہید نگر جا رہا ہوں۔''

''ہوں''۔

''اور آپ؟

''میں گھر جا رہی ہوں''۔

''گھر؟''

''ہاں گھر۔''

''لیکن یہاں آپ کا گھر''۔

''یہاں میں نوکری کر رہی ہوں۔'' اُس کی آنکھوں میں دُھند پھیل گئی اور وہ رُک کر بولی۔

''اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرا گھر ہی نہیں اور اگر ہے تو میرے ساتھ ساتھ ہے۔''

میں تعجب سے اُسے دیکھتا رہا۔

''میں صرف ایک روز کیلئے جا رہی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کل سڑک پر آپ نہیں ملیں گی؟''

''آپ بھی تو نہیں ہوں گے'' وہ ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس دیا۔

اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے۔ میں شاید انسانی تعلقات کی غیر متوقع تبدیلیوں کی پُر اسراریت پر سوچ رہا تھا۔

وہ میری ہم سفر تھی۔ بس سیدھی سڑک پر جا رہی تھی اور میں اُس کی بات سُن رہا تھا۔ پیاری پیاری باتیں، دل میں اُترنے والی، بے لاگ۔ وہ خود اعتمادی سے بول رہی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں اُس کے وجود کی تنہائیوں میں اپنے بند ھے پر کھول رہا ہوں اور میرے سامنے ایک کے بعد دوسرا اُفق روشن ہو رہا ہے، وہ ایک دُبلی پتلی سی عورت تھی۔ چہرے پر زردی لئے ہوئے۔ لیکن جس کی شخصیت میں ایک ناقابل بیان دل کشی تھی۔

اُف مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

میں نے خیالوں کے ریلے کو ذہن سے پرے جھٹک دیا اور پوری توجہ سے فائل پر جُھک گیا۔ دو تین کیسوں سے نمٹنے کے بعد میرا ذہن پھر میرے قابو سے باہر ہو گیا۔

اتوار کی شام کو میں ہوٹل روڈ پر بے مقصد پھر رہا تھا۔ بجلی کے قمقموں کی روشنی میں سڑک بالکل عریاں پڑی تھی اور سڑک کے دورویہ شیشے کی الماریوں سے سجی ہوئی دُکانوں سے روشنی کا سمندر باہر آ رہا تھا۔ میں روز اس سڑک پر گھومتا ہوں، یہ سڑک شام کو لہرائے رنگوں، دہکتی خوشبوؤں اور جھلملاتے قہقہوں سے آباد ہو جاتی ہے۔ خوبصورت عورتوں کے لچکیلے جسموں کی سُلگتی قوسیں سلیولیس باہنوں کی خوشبو۔ چمکتی سڈول پنڈلیاں اور میں سنسان راستوں پر اکیلا چلتا ہوا رات گئے گھر پہنچتا ہوں۔ تکان سے نڈھال۔ خیالوں میں دُنیا بھر کا انتشار لئے ہوئے تاریکی میں لپٹی ہوئی خستہ حال سیڑھی۔ دیواروں پر کالے دھبے، کمرے میں چیزوں کا انتشار، بے ترتیبی، نحوست، وحشت، میلے سے بستر پر پڑے بچے اور رضیہ کا غصہ و غم سے کھولا ہوا وجود۔ اُس کے زرد سے استخوانی چہرے پر ہانپتی ہوئی پرچھائیاں، آنکھوں میں بیزاری اور تھکن۔ پپڑی جمے ہونٹ اور میں تشنج کی حالت میں اپنے کمرے میں جا کر جسم کی لاش کو بستر پر گرا دیتا ہوں اور ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں۔

میرے تھکے قدم نیشنل بک سینٹر کی طرف اُٹھے۔ کیوں نہ کوئی تازہ ناول خریدا جائے۔ میں دُکان کے اندر آیا اور اندر سے وہ باہر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے قدم رُک گئے، وہ مُسکرائی ''آپ'' اُس کے چہرے پر زردی تھی۔ بال خشک اور اُلجھے ہوئے۔ پپوٹے بھاری۔

''ہاں، لیکن آپ کو کوئی شک ہے کیا؟'' اُس کی سیاہ آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی۔

''نہیں تو''۔

اور وہ جانے لگی۔ مجھے چُپ سی لگ گئی تھی، اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں اس سے کس موضوع پر بات کروں؟ وہ جا رہی ہے۔ میں کچھ دیر کے لئے اُسے روکنا چاہتا تھا۔ اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں! مجھے اُس سے باتیں کرنے میں بہت مزہ ملتا ہے۔ لیکن ''اچھا گڈ بائی''۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''گھر!''

''چلئے میں ایک چوک تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''شکریہ۔!''

اور پھر ہم نیم تاریک سڑکوں پر ساتھ چلتے رہے۔ ہم دونوں خاموش تھے! اور پھر اُس نے خاموشی توڑ دی ''تین کمروں کا سیٹ ہے، اور کچن، اور کرایہ ساٹھ روپے۔ میں سکول سے آکر کھانا پکاتی ہوں، اور مُنّی کو دودھ پلاتی ہوں۔ اس کے بعد میری حالت دیکھنے کی ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔ کھوکھلی سی اُجاڑ ہنسی۔ ''میں تنہا رہ جاتی ہوں، اور تنہائی مجھے پریشان کرتی ہے۔ یہاں کوئی جان پہچان کا انسان بھی نہیں۔ دل بات کرنے کو ترستا ہے۔ میں اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ کبھی اُٹھتی ہوں اور کمروں میں ہانپتی ہوئی پھرتی ہوں۔ خاموشی میرے اعصاب کو کچلتی ہے۔ دیواریں قریب آکر گھیر لیتی ہیں اور میرے سینے میں کتنی چیخیں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔

ڈاکٹروں نے کہا۔ مجھے نیوراسس...... ہو گیا ہے۔ شاید سچ کہہ رہے ہوں گے۔ عجیب گھٹن سی ہوتی ہے گھبرا کے کتاب ہاتھ میں اُٹھاتی ہوں۔ تقریباً روز ایک نئی کتاب خریدتی ہوں۔ اگر مجھے کتاب نہ ملے میں خودکشی کرلوں، ہاں ہاں خودکشی۔ بھلا زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ چھ سال سے میں زندگی کے بوجھ کو شانوں پر اُٹھائے پھر رہی ہوں۔ ہاشم صاحب شہید نگر میں جام فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ اُنہیں وہاں بہت کام رہتا ہے۔''

''ہاشم صاحب آپ کے پاس کیوں نہیں آتے؟''

''وہ نوکری چھوڑ کر کیسے آئیں گے؟'' اور پھر مجھ سے زیادہ اُنہیں اپنی بہن زاہدہ عزیز ہے جو اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ اُن کے گھر میں حکمرانی کرتی ہے۔ ہاشم صاحب زاہدہ

سے بہت ڈرتے ہیں۔مجال ہے کہ گھر میں زاہدہ کے حکم سے کوئی سرتابی کرے۔اُن کے اشارے کے بغیر وہاں پتا بھی نہیں ہلتا۔اور مجھ سے صرف اس لئے ناراضی ہے کہ میں یہاں نوکری کیوں کرتی ہوں۔نوکری۔نوکری نہ کروں تو کیا کروں؟ ہاشم صاحب مہینے کے آخر میں ڈیڑھ سو کی ڈیڑھ سو رقم زاہدہ کی ہتھیلی پر رکھ دیتے ہیں۔اور دوسری تاریخ کو میرے پاس دوڑے چلے آتے ہیں۔اور عجیب سلسلہ ہے۔میری نوکری کو تو ایک بہانہ بنایا گیا ہے۔ہاشم یہ باتیں کہاں سمجھیں گے اُن کی کھوپڑی میں اُن کے قد کے مُطابق ہی تو بس اتنا سا بھیجا ہے۔سچ پُوچھئے تو یہ زندگی زہر لگتی ہے اور سوچ سوچ کر میری رگوں میں زہر پھیل جاتا ہے۔

وہ سڑک کے تاریک غبار میں تحلیل ہو چکی تھی۔

اور میں کرسی میں بُت کی طرح نصب ہو چکا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے بیل بجائی۔خاموشی چیخ اُٹھی۔چپراسی اندر آیا اور اُس نے سپرنٹنڈنٹ کی میز سے ڈاک کی ٹرے اُٹھائی اور میرے سامنے رکھی۔میں اُسے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔اتوار کو موسم اچانک بدلا بادل آئے اور برسے، میں گھر میں قید ہو کر رہ گیا۔دل کی وحشت بڑھنے لگی اور پھر رضیہ کی چیخ چیخ ابھی پندرہ تاریخ کو اُس کے چچازاد بھائی کی پانچویں لڑکی کی شادی ہو رہی تھی اور وہ آج ہی سے بضد تھی کہ سونے کی مالا بازار سے خریدی جائے۔یہ وہی چچازاد بھائی ہیں جن کی شکل بھی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔خیر! معاملے کے اس پہلو پر مجھے توجہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔لیکن اُس کا مالی پہلو میرے لئے پریشان کُن ضرور تھا۔کم سے کم تین سو روپیوں کا بندوبست کرنا معمولی کام نہ تھا۔لیکن رضیہ اس پر سوچنے کی زحمت کیوں کرتی؟ وہ سوچتی کم اور بولتی زیادہ ہے اور میں تلملا کر وہاں سے نکلا۔اس جاہل عورت کو سمجھانا میرے بس کا کام نہیں۔بس سٹاپ پر بس رُکی اور مجھے اس کا احساس اس وقت ہوا جب بس چلی گئی۔اور میں پیدل چلنے لگا انسان عجیب مخلوق ہے۔خود ہی گلے میں آہنی زنجیریں ڈالتا ہے۔خود ہی آزادی کیلئے پیچ وتاب کھاتا ہے۔میرے سینے کا بوجھ بہت بھاری ہو چکا تھا۔میں کہاں جا رہا تھا مجھے بالکل احساس نہ تھا۔لیکن اس خیال سے سکون مل رہا تھا کہ گھر سے دُور جا رہا ہوں۔گھر جہاں نحوست کے سائے منڈلاتے ہیں۔جہاں ہر لمحہ عذاب ہے۔کتنی جاہل اور ضدی عورت میرے پلے

باندھی گئی ہے۔اور آج دس سال سے یہ بوجھ میری گردن پر سوار ہے۔اُف! یہ کوئی زندگی ہے جہاں پتھر برستے ہوں وہاں کوئی کب تک اپنے آئینے کی نگہداشت کرے۔میرے دل کا آئینہ کب کا چکنا چور ہو گیا تھا۔

لیکن میں اب گراونڈ روڈ سے چوک کی طرف آرہا تھا۔لوگوں کی بھیڑ میں اضافہ ہورہا تھا۔ میں نے کنال روڑ کا رُخ کیا۔میں چلتا رہا اور میرے دل و دماغ سے دھواں اُٹھتا رہا۔اچانک میرے قدم رُک گئے۔یہ ایک خاموش گلی تھی اور میرے سامنے ایک نئی بنی ہوئی سہ منزلہ عمارت تھی۔پلاسٹر اور رنگ وروغن سے عاری۔میں نے دروازے کی کنڈی ہلائی۔ایک لمحہ گزر گیا۔

میں نے پھر کنڈی ہلائی۔معاً اندر سے کوئی سرگوشی سرک آئی۔قدموں کی چاپ اُبھری اور پھر دروازہ کھل گیا۔ایک ادھیڑ عمر کی عورت سوالیہ نشان بنی ہوئی میرے سامنے کھڑی تھی۔

''میں مسز ہاشم سے ملنا چاہتا ہوں وہ گھر ہی میں ہیں؟''

آیئے،آیئے اُوپر ہیں۔''

میں زینوں پر قدم رکھ رہا تھا اور میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔عورت نے دوسری منزل میں دہلیز کے بائیں طرف ایک کمرے میں مجھے بٹھایا۔اور خود باہر چلی گئی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔کمرے میں کوئی نہ تھا۔چند معمولی سی چیزیں کمرے میں رکھی تھیں۔دو تین پُرانی کرسیاں۔روغن سے عاری دیواریں،دیواروں پر چند تصویریں آویزاں،کمرہ صاف تھا اور ایک طرف دری پر پُھول دار چاندنی بچھی ہوئی تھی۔سامنے کی دیوار کے اندر الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔بہت سے رسالے۔مجھے مسز ہاشم کی عظمت کا احساس ہوا۔کتنی کتابیں......میرے دل میں مایوسی نے چٹکی لی۔انسان کتنا بے بس ہے۔مجبور!اور حالات کتنے سنگین۔کالج میں پڑھنے کے دوران میں نے کیا کیا خواب بُنے تھے۔میں کسی کالج میں پروفیسر ہو جاؤں گا۔اور میرا سب سے قیمتی سرمایہ کتابیں ہوں گی۔ گھر میں ایک لائبریری ہوگی۔لیکن والد صاحب کی بے وقت موت نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل ڈالا اور میں اریگیشن آفس کے اُس تاریک کمرے میں قید ہو کر رہ گیا۔یہ زرد سی میلی دیواریں،یہ پھٹیچر سا فرش۔

یہ ہم دونوں چائے پی رہے تھے اور کھڑکی پر شام بجھ رہی تھی ''میں زندگی سے بھاگ

آیا ہوں۔'' ''زندگی سے کوئی بھاگ نہیں آسکتا۔'' ''کیوں؟'' ''اس لئے کہ زندگی انسان کا تعاقب کرتی ہے۔آپ بھاگتے ہیں اور وہ آپ کے؟''

''اور موت......۔''

''وہ شکست ہے۔انسان کی فطرت میں شکست نام کی کوئی چیز نہیں۔میرا یہ عقیدہ اب مضبوط ہوتا جارہا ہے کہ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ایک بار اسے خوب گلے لگاؤ، اسے پیار کرو، اسے اوڑھنا بچھونا بناؤ، اسکی لذّتوں سے رُوح میں قوس قزح کے رنگ بھرلو۔زندگی کا ہر لمحہ یہی آواز دیتا ہے لیکن کتنے ہیں جو اس آواز کو سنتے ہیں؟''

اس کے لہجے میں وارفتگی تھی۔آنکھوں میں خود آگہی کا نُور تھا۔اور مجھے حیرت ہورہی تھی کہ عورت اور عورت میں کتنا فاصلہ ہے وہ میرے پاس ہی کرسی پر اطمینان سے بیٹھی تھی۔ سادہ سے معمولی لباس میں ملبوس جو اس کی تنگدستی اور غریبی کو ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر کتنی امیر تھی۔

''ہاشم صاحب نے شادی کے ایک سال کے بعد زاہدہ کے کہنے پر مجھ سے جھگڑا کیا، سخت جھگڑا۔مجھے گالیاں دیں اور جوتے سے مارا اور زبردستی سے میکے بھیج دیا اور دو سال تک میری خبر نہ لی۔یہ اُن دنوں کی بات ہے۔جب منی پیدا نہ ہوئی تھی۔اور پھر جب میں رو رو کر ہلکان ہوئی جارہی تھی اور اپنے لئے دق کی بیماری مول لینے کی تیاری کررہی تھی۔ پروفیسر فضل سے میری ملاقات ہوئی۔عجیب لااُبالی کی طبیعت کے مالک ہیں۔آزاد، بے باک، اپنی سوچوں پر زندہ رہنے والے۔فرسودہ اخلاق۔مذہب اور تہذیب کی نام نہاد قدروں کے زبردست مخالف۔اُنھوں نے ایم اے کے دوران میری بڑی مدد کی، میں اُن کے گھر اُن سے ملنے جاتی اور گھنٹوں تک اُن سے باتیں کرتی۔پروفیسر فضل نے ایک نئ آگہی دی زندگی حُسن ہے اور حُسن کو گلے لگاؤ، اور مسرتوں سے اپنا دامن بھرلو۔'' لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔

''کاش میں نے پروفیسر فضل کی بات مانی ہوتی۔اُس نے آہ کھینچی۔

''کون سی بات۔؟'' ''وہ......وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔''

اُس کے چہرے پر حیا کی سُرخی اُبھری اور ہٹ گئی...... ''اُس وقت شاید میں ذہنی طور پر اتنی فارورڈ نہ تھی۔اُن کی بیوی تھی اور چار بچے۔اُس زمانے میں یہ میرے لئے ایک

سنگین مسئلہ بن گیا تھا۔ آج مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آتی ہے۔ ہاشم کا وجود اور عدم میرے لئے آج بھی یکساں ہے اور اُس زمانے میں بھی تھا...... اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ گھر کا سُکھ اور مسرت بے معنی ہے، بے معنی۔ دُکھ اور سُکھ انفرادی تجربہ ہے۔ انسان اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ اور اپنے لئے مرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ لمحوں میں ہوتا ہے......۔"

مسز ہاشم اعتماد اور بے باکی سے بول رہی تھی اور میں اُس کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اور جب میں شام کے اندھیرے میں وہاں سے نکلا تو وہ کہہ رہی تھی۔

"اتوار کو ضرور آیئے۔ رات کا کھانا یہیں کھائیں گے۔"

"ضرور آؤں گا اور خوب باتیں ہوں گی۔"

اتوار کی رات کو میں وہاں گیا۔ باہر چبھتی ہوئی سرد ہوا چل رہی تھی کمرے میں داخل ہو کر مجھے گرمی اور آسودگی کا احساس ہوا۔ مسز ہاشم نے بہت لذیز کھانا پکایا تھا اور کھانا کھانے کے بعد ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ منّی کو میری گود میں کھیلتے کھیلتے نیند آگئی تھی اور ادھیڑ عمر کی عورت نے اُسے دوسرے کمرے میں سلایا تھا۔ کمرے میں اب صرف ہم دو بیٹھے تھے۔ ادھیڑ عمر کی عورت اوپر کی منزل میں اپنے کمرے میں نماز پڑھنے گئی تھی۔ مسز ہاشم نے باریک لکیروں والا ایک سُرخ رنگ کا سُوٹ پہن لیا تھا۔ اُس کے سینے کا بہت سا حصہ کھلا تھا اور بجلی کی روشنی میں دلفریب نظر آرہا تھا۔ اُس کا چہرہ پوڈر کی ہلکی تہہ سے چمک رہا تھا۔ کپڑوں اور بالوں سے سینٹ کی لطیف خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس کی سرمگیں پلکیں بوجھل تھیں۔ اور خواب آلود! وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا اور...... اور وہ بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔

اچانک وہ چپ ہوگئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ پرے کھینچ لیا۔ اُس کی آنکھیں جھک گئیں، میں چونک سا گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟" اُس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوگئی، اور میں اُس کے خوبصورت جسم کو دیکھ رہا تھا۔ "کیا بجا ہوگا......؟" اُس نے انگڑائی لی۔

"بارہ بج چکے ہیں......" میں نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اب اجازت چاہوں گا......!!"

"باہر تیز بارش ہورہی ہے اور آندھی چل رہی ہے۔ آپ ...... یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہے۔"

دوسرے لمحے مسز ہاشم میرے بازوؤں کے حلقے میں تھی۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں، اور وہ سانسوں میں اُلجھ اُلجھ کر کہہ رہی تھی۔

"زندگی میں پہلی بار میں کسی سے قریب آئی ہوں اور میرا دل سچی محبت سے دھڑکا ہے......"

"محبت......" میرے احساس میں رنگ و نُور کی پُھوار برس رہی تھی۔ ریڈیو سے آخری فرمایشی گانا نشر ہو رہا تھا، اور میں جلدی سے کمرے سے نکل رہا تھا۔ رضیہ نے مجھے دیکھ کر اپنا مُنہ پھیر لیا۔ اُس کے پپوٹے پُھولے ہوئے تھے، اور چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔۔

سڑک کے موڑ پر میری نظریں اُٹھیں تو ...... وہ سامنے سے نمودار نہ ہوئی اور میں زیر لب مسکرایا۔

دوسرے دن بھی وہ وہاں نظر نہ آئی۔

تیسرے دن بھی ...... ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ وہ سوموار کی صبح ہی کو اپنا سارا سامان لے کر چلی گئی......"

وہ کیوں چلی گئی۔

کیا وہ واپس نہ آئے گی۔

آج بھی جب میں بنڈ روڈ کی نشیبی سڑک پر چل رہا تھا تو موڑ پر وہ نظر نہ آئی اور مجھے محسوس ہوا کہ راستے میرے لئے تاریک ہو گئے ہیں۔ اور میں جسم کی لاش تو گھسیٹتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں ...... مسز ہاشم کو اتنے قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کے باوجود ...... کیا میں نے مسز ہاشم کو سچ مچ قریب سے دیکھا ہے۔

"اظہار صاحب کمال ہے۔ تین بج رہے ہیں اور آپ نے ابھی تک ارجنٹ کیس بھی واپس نہیں کیئے۔ کیا آپ سو رہے ہیں۔ یا کام کر رہے ہیں ...... داس جی کا چہرہ کالی دیوار کو پھاند کر میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔

اور مجھے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آئی۔ سپنوں میں اُلجھنے کا بھلا یہ کونسا موقع ہے...... میں نے دل کو سمجھایا۔

☆☆☆

پشکر ناتھ

پیر پنچال کا آخری کوّا

اس نے اپنے بدن پر جمی ہوئی برف کو جھاڑا، اور گردن اُٹھا کر پیر پنچال سلسلے کے پہاڑوں پر دور دور تک نظر دوڑائی۔ چاروں طرف برف کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے زندگی کی تمام حرارتیں سفید چادریں اوڑھ کے سو رہی ہوں۔

اس کے چہرے پر ہنسی کا ایک سایہ لرز گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ تم کیا سمجھے تھے کہ رات بھر کے اس برفانی طوفان میں، یہ مر گیا ہوگا؟۔ کتنے نادان ہو۔ اگر میں مر جاتا تو تم بھی باقی نہیں رہتے۔ یاد نہیں تمھاری روح میرے قبضے میں ہے؟۔

میں لرز گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری روح اس کے قبضے میں ہے۔ سالہا سال سے ہے۔ مگر پتہ نہیں میں اس سانحے کو بھولنا کیوں چاہتا تھا۔

یہ سانحہ کئی سال پہلے میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ابھی جواہر ٹنلی نہیں بنی تھی۔ اور وادی میں داخل ہونے کے لئے اس چھوٹی سی سرنگ کا سہارا تھا، جو پہاڑ کے اوپر چوٹی کے قریب بنائی گئی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی پر ان دیوقامت، کریہہ المنظر، گہری سیاہ رات کی طرح کالے کوؤں کا ایک قافلہ آباد تھا۔ دامنِ کوہ میں بسے ہوئے گاؤں کے لوگ انھیں پنچال کے کوّوں کے نام سے جانتے تھے۔ یہ کوّے کبھی نیچے آباد گاؤں میں نہیں جاتے تھے، صرف ان کے قصے وہاں جاتے تھے۔ دل دہلانے والے، سر اس جگانے والے اور ہیبت طاری کرنے والے قصّے۔

کبھی کبھی یوں ہوتا تھا کہ لاریاں وادی کے لیے روانہ ہوتی تھیں۔ تہہ در تہہ پہاڑی سلسلے کو کاٹ کے بنائی گئی، کسی اژدہے کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر سے گزر کر، یہ لاریاں جب بانہال نامی قصبے سے نکل کر پنچال کے اس آخری پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگتی تھیں، تو اچانک برف کا طوفان انھیں گھیر لیتا تھا، اور یہ لاریاں بے بس ہو کر چوٹی کے قریب بنی ہوئی سرنگ سے لے کر بہت نیچے، سڑک کے نچلے موڑ تک کھڑی ہونے پر مجبور

ہو جاتی تھیں۔ لاریوں میں سوار لوگ اپنی سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے سردی اور یخ بستہ ہواؤں سے ٹھٹھرنے لگتے تھے۔ اس بات کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ صورت حال کتنے دن قائم رہے گی۔ پھر یوں ہوتا تھا کہ دو ایک روز انتظار کرنے کے بعد کچھ جیالے قسم کے لوگ لاریوں میں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈ اور بھوک سے بے حال ہونے کی بجائے، پیدل چل کر پنچال کے اُس پار جانے کے لیے روانہ ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ تو پہاڑ پار کر کے قاضی گُنڈ نامی قصبے تک پہنچ پاتے تھے۔ اور کچھ جلدی گھر پہنچنے کا خواب آنکھوں میں لے کر اپنے گھر کی بجائے خدا کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ شدت کی سردی، بھوک اور ''شینہہ مایئے'' کی تاب سبھی جیالے نہیں لا سکتے۔ ''شینہہ مایئے'' اس کیفیت کو کہتے ہیں، جب برف کے اوپر چلتے چلتے شدت کی نیند کا غلبہ طاری ہو جاتا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ بیٹھ کر تھوڑی دیر ستانے بیٹھ گیا، تو دوبارہ کبھی نہیں اٹھ سکتا۔ نیند کا ایک جھونکا اسے ابدی نیند سلا دیتا ہے۔ زندہ رہنا ہے چلتے رہو چلتے رہو چلتے رہو۔

میں بھی چلتا رہا چلتا رہا، چلتا رہا۔ اور بھی لوگ چل رہے تھے۔ ہزاروں، لاکھوں لوگ، ہر صوبے کے، ہر شہر سے، ہر گلی سے، ہر گوشے سے، چلتے رہے۔ چلتے رہے۔

چلتے چلتے وہ گول ستونوں والی اس عمارت تک پہنچ گئے، جہاں مقدر کے ساتھ ان کا ٹکراؤ ہو گیا۔ یعنی آمنا سامنا ہو گیا۔

مگر میں کہیں نہیں پہنچا۔ اتنے میں، میں نے دیکھا کی بہت سارے دیو قامت، کریہہ المنظر، گہری سیاہ رات کی طرح کالے کوّے چھینا جھپٹی میں محو ہیں۔ برف کے اندر میرے پاؤں اور گہرائی تک دھنس گئے۔ لگتا تھا کوئی قسمت اور حالات اور وقت کا مارا ہوا آدم زاد برف کے اوپر سو گیا تھا۔ اور سو کر کھو گیا تھا۔ اب یہ پنچال کے ہیبت ناک کوّے اسے نوچ رہے تھے۔ سفید چمچماتی برف کی دودھیا چادر پر یہاں وہاں خون کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ اچانک مجھے اُبکائی آئی۔ درد سے میرا بدن دوہرا ہو گیا۔ میں نے چلانا چاہا مگر آواز حلق سے باہر نہیں آسکی۔ میں نے اپنے اریب قریب اور دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ میرے ساتھی کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ میری نبض جیسے رُک گئی اور میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ آدمی جب اکیلا رہ جاتا ہے تو شاید ہی کچھ ہوتا ہو گا۔ میں ہوش میں کب آیا۔ یا آیا بھی تھا یا نہیں۔ میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اس حالت میں، میں کب تک پڑا رہا، مجھے معلوم نہیں۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدن میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔ اسی چبھن کے درد سے گھبرا کر میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے دیکھا کئی کالے بھجنگ کوّے میرے جسم پر بیٹھ کر، مجھے ٹھونگیں مار رہے ہیں۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔ اسی وقت ایک کرخت آواز سنائی دی۔ بیوقوفو! کیا کر رہے ہو؟ اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں کیا رکھا ہے، جو تم نوچنا چاہتے ہو؟ چھوڑ دو اسے۔

پھر اس کا کیا کریں گے؟ میری چھاتی پر بیٹھے ایک خونخوار کوّے نے پوچھا۔

پڑا رہنے دو۔ بچوں کے کھیلنے کے کام آئے گا۔ چنانچہ مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اور تب سے میں بچوں کے کھیلنے کے کام آتا رہا۔ حتیٰ کہ موسم بدل گیا۔ برف پگھلنے لگی۔ برف کی تہہ کے نیچے ہری بھری گھاس نظر آنے لگی۔ کہیں کوئی جنگلی پھول کھل کر اپنے چاروں طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ کیا میں بھی کبھی زندگی میں اب ہنس سکوں گا۔

شاید آتی ہوئی بہار کا اشارہ تھا، یا زندہ رہنے کا ارمان تھا کہ ایک رات میں بھاگ نکلا۔ راستوں کا پتہ نہیں تھا، سمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مگر میں بھاگ نکلا۔ رات گہری تھی ہوا خنک تھی۔ زندہ رہنے کا ارمان جوان تھا۔ میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا، بھاگتے بھاگتے گھر یاد آیا۔ گھر کا آنگن یاد آیا۔ دریا کا کنارہ اور دوسرے کنارے پر کسی کا انتظار یاد آیا۔ آنکھوں کے نیچے دھواں سا چلنے لگا۔ دو چار آنسو پلکوں پر لرزنے لگے، اور میں بھاگتا رہا۔ اچانک رات کے اندھیرے میں کچھ کرخت آوازیں سنائی دیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے گہری سیاہ رات کی طرح کالے کوؤں کا ایک غول سر کے اوپر منڈلانے لگا۔ پھر میں نے اپنے جسم پر ان کی چونچوں کی ٹھونگیں محسوس کیں۔ خون کی پتلی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ بھاگ کر کہاں جاؤ گے بےوقوف۔ ان میں سے ایک کوّے نے آواز دی۔

چنانچہ مجھے دوبارہ اسی جگہ پر واپس لایا گیا۔ جہاں میں بچوں کے کھیلنے کے کام آ رہا تھا۔ پھر وہ بھیانک قہقہہ سنائی دیا۔ آج تک ہمارے چنگل سے کوئی بچ کر جا سکا ہے، جو تم نے یہ جرأت کی تھی بےوقوف؟۔

دوسرے دن فیصلہ ہوا، اور پنچال کے اس کوّے نے میری روح قبض کر لی۔ اب تم کبھی بھاگ نہیں سکو گے۔ اس سانحے کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ میں پھر کبھی بھاگ نہیں سکا۔

ایک دن خبر آئی کہ پاس کے جنگل میں ایک جہاز گر کر تباہ ہو گیا ہے۔ اور جہاز میں سوار تمام مسافر ہلاک ہو گئے ہیں۔ خبر سنتے ہی تمام کے تمام کوّے پر تولنے لگے۔ مگر اڑ نہیں پائے۔ کیوں کہ جو کوّا یہ خبر لایا تھا، اس نے منع کر دیا۔ ہم لوگ وہاں نہیں جا سکتے، وہاں نشیبی گاؤں کے لوگ اور پولیس کے کچھ سپاہی پہلے ہی پہنچ گئے ہیں۔

لوگوں کی اور پولس کی اتنی پھرتی پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی، پھر آج یہ پھرتی کیوں؟۔ کسی کوّے نے غصیلی آواز میں پوچھا۔

کہتے ہیں اس جہاز میں کئی سرکاری افسر سوار تھے۔

یہ سرکاری افسر کیا ہوتا ہے دادا کوّا؟ ایک کوّا بچے نے معصومیت سے پوچھا۔

سرکاری افسر ایک اونچے نسب کا آدم زاد ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھوں میں تمام آدم زادوں کی قضا و قدر رہوتی ہے۔

تو ایک طرح کا بادشاہ سلامت ہی ہوا۔ ایک بچے نے میرے گال پر اپنی چونچ سے ٹھونگ مار کر کہا۔ یہ کوّے کے بچے ہر سوال سے پہلے اور جواب کے بعد میرے جسم کے کسی نہ کسی حصے پر ٹھونگ کیوں مارتے ہیں۔ بہت درد ہوتا ہے۔

اچانک ایک شور بلند ہوا۔ تمام کوّے ایک ساتھ چلانے لگے۔ ہم سرکاری افسر بنیں گے۔ ہم بھی سرکاری افسر بنیں گے۔

اس رات کوّے دیر تک جاگتے رہے۔ ہر جاندار کی طرح ان کو بھی اپنے بچوں سے پیار تھا۔ سرکاری افس بنیں گے۔ بچوں کا اصرار تھا۔

چنانچہ دوسرے دن اجازت پاکر سارے کوّے پیر پنچال پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں سے اڑان بھر کے شہروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ مختلف شہروں کے کچھ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ اس دن اتنے سارے کوّے آسمان پر اُڑ رہے تھے کہ سورج کی کرنیں زمین تک پہنچ نہ پائی تھیں، اور شام ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ چناچہ پیر پنچال کے مشہور کوّے سیکریٹریٹ کے لمبے برآمدوں میں، پولیس کے بارکوں میں، نظامت کے کمروں میں، عدلیہ کے ایوانوں میں، ہسپتالوں کے وارڈوں میں، تعلیم کے میدانوں میں، تمدن کے گلستانوں میں دور دور تک پھیل گئے اور آدم زادوں کے ہجوم میں گھل مل گئے۔

آدم زادوں کے ساتھ گھل مل تو گئے، مگر کوّے آخر کوّے ہوتے ہیں۔ چھینا جھپٹی اور

پرائے مال پر چونچ مارنے کی خو کیسے بھول سکتے تھے۔ چنانچہ چھینا جھپٹی کا کھیل شروع ہو گیا۔ پہلے گلی ڈنڈا، پھر کُشتی، پھر فٹ بال۔ آدم زادوں کے سرفُٹ بال کی طرح گول کیوں ہوتے ہیں۔ ٹھوکر مارو تو دور تک لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔

جب مختار احمد کو پرائمری اسکول ٹیچر کا آرڈر ملا، تو اس کا باپ محکمہ کے ہیڈ کلرک صاحب کے گھر ایک دیسی مرغا لے کر گیا تھا۔ اور بیس سال کے بعد جب مختار احمد نے اپنی شائستہ مختار کو اسکول ٹیچر کی تقرری کا پروانہ لا کر دیا، تو اس نے محکمے کے ڈائریکٹر صاحب کو چالیس ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

جب رگھبیر سنگھ جالی نے اپنے بیٹے سکھوندر سنگھ جالی کو ویٹرنری ڈاکٹری کی ٹریننگ کا آرڈر لا کر دیا تھا تو اس نے گھر آ کر ایک زور کا قہقہہ مارا تھا۔ پنجابی زبان میں ایسے قہقہے کو ''گھڑاکا'' کہتے ہیں۔ پچاس ہزار لے کر گیا تھا پُتر۔ مگر پینتالیس ہزار ہی دے کر آ گیا۔ پانچ ہزار روپے بچا کر لے آیا ہوں پُتر۔ پورے پانچ ہزار روپے اور پورے اٹھارہ سال کے بعد جب سکھوندر سنگھ جالی نے اپنی بیٹی ہرپریت کور کو ایم بی۔ بی۔ ایس میں داخلہ دلوایا تھا تو پورے دو لاکھ روپے کا سوٹ کیس وزیر موصوف کی الماری میں رکھ آیا تھا۔ کچھ بھی بچا کر نہیں لا سکا تھا۔ اور جب گوکل ناتھ راز دان نے اپنی بیٹی کو بی۔ ایڈ میں داخلہ دلوایا تھا تو کُل گیارہ ہزار روپے کا خرچہ آیا تھا۔ اور اکیس سال کے بعد جب راج دُلاری راز دان نے اپنے بیٹے کو سول انجینئرنگ کی ٹریننگ کے لیے سیٹ دلوائی تھی تو بڑی منت سماجت کے بعد ایک لاکھ نوے ہزار نقد پر سودا پٹ سکا تھا۔ پتہ نہیں باقی دس ہزار کا وعدہ نقد کا تھا یا جنس کا۔

رفتہ رفتہ کام بڑھ گئے۔ دام بھی بڑھ گئے۔ رنج بھی بڑھ گئے۔ آلام بھی بڑھ گئے۔

جب باپ کسی کام نہ آئے تو باپ کیسا؟ اندر ہی اندر غصے میں پھُنکتے ہوئے محمد یوسف نجّار نے آخری بار اپنے باپ کی طرف دیکھا، اور گھر سے بھاگ گیا، کیا کرتا؟۔ اچھے نمبر ہی لا سکتا تھا نا، سولا کے دِکھائے تھے مگر باپ کے پاس پیسہ نہیں تھا۔ دولت کے بازار میں خالی ہاتھ پھرنے والا بھکاری کیا اور اس کی اوقات کیا۔ گھر سے بھاگ کر محمد یوسف نجار نے چرس کا کاربار شروع کیا۔ پیسہ بھی کمایا۔ دو ایک بار جیل بھی گیا۔ مگر اس کا کیا۔ جیل جانا ایک کامیاب زندگی کا سمبل مانا جاتا ہے۔ چاہے چرس کے کاروبار کے لئے جاؤ، چاہے انکم ٹیکس کی چوری کے لیے جاؤ۔ چاہے رشوت لینے کے سلسلے میں جاؤ، چاہے مویشیوں کا

چارہ چرانے کے لیے جاؤ۔ چاہے بندوق کی نوک پر نقد اور جنس چھیننے کے جرم میں جاؤ، چاہے دنگا فساد کرانے کے لیے جاؤ۔ مگر جاؤ تو سہی۔ کیوں کہ کامیابی، امارت اور عزت کی اس سے بڑی سند اب کوئی نہیں ہے۔

چنانچہ جب سے پنچال کے یہ کالے، مہیب، مکروہ اور گھناؤنے کوّے آدم زادوں کی صفوں میں گھل مل گئے ہیں، ہر چیز کے معنی بدل گئے ہیں۔ ہر رشتے کے خدوخال بدل گئے ہیں۔ ہر جذبے کے دام مقرر ہو گئے۔ محبت کے دام، عزت کے دام، جذبے کے دام، ایمان کے دام، عبادت کے دام، دام ادا کرو، کام ہو جائے گا۔ رشتہ قائم ہو جائے گا۔ زندگی کی ہر صعوبت میں آرام ہو جائے گا۔ اور پھر لوگوں نے دام ادا کرنا شروع کیا۔ سکریٹریٹ کے لمبے برآمدوں میں فائلیں، کاغذات اور حکم نامے دام کی مناسبت سے سست یا تیز رفتاری سے گھومنے لگے۔ پولیس کی بارکوں میں، تعزیرات کی بلند و بالا عمارت میں چور دروازے تلاش ہوئے۔ نظامت کے کمروں میں بند لفافے اور بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانے لگے۔ عدلیہ کے ایوانوں میں گایوں نے دستار کھانے شروع کر دے۔ ہسپتالوں کے وارڈوں میں جواب نامے اور THESIS بیچے اور خریدے جانے لگے۔ تمدن کے گلستانوں میں دلال داد وصول کرنے لگے۔ بے چارہ شاعر کسمپرسی کے عالم میں جوان مرگ ہو گیا۔ افسوس! میں ماتم بھی نہ کر سکا۔ کیسے کرتا؟ میری روح تو پنچال کے اس ہیبت ناک کوّے نے قبض کر رکھی ہے۔

کئی سالوں سے میں پنچال کے اس آخری کوّے کی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ چند سال پہلے خبر آئی تھی کہ پوکھران کے ریگستان میں ایک کوّا مرا ہوا پایا گیا۔ اُس رات میں اطمینان، امن اور سکون کی نیند سو گیا۔ ایک خوبصورت سا خواب بھی دیکھا۔ دریا کے پار انتظار کرنے والے کے پاس گیا۔ اور خواب میں ہی کئی سالوں کے بعد، یا کئی دہائیوں کے بعد خوب دل کھول کو ہنسا۔ صبح جونہی روشنی ہوئی، تو میں نے ڈرتے جھجکتے اوپر صنوبر کے اس بوڑھے درخت کی شاخوں کی طرف دیکھا۔ اور میرا خواب ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ پنچال کا آخری کوّا بدستور ایک شاخ پر بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔

وہ کوئی اور تھا بے وقوف! میں نہیں تھا۔ اس نے ایک قہقہہ مارا اور دور تک پنچال سلسلے کے پہاڑوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ کہتے ہیں جس آدم زاد کی روح قبض کر لی گئی ہو، وہ

زندہ نہیں رہتا۔ مجھے اپنے زندہ نہ ہونے کا کوئی ملال نہیں۔ میں زندہ ہوں یا مر گیا ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر پنچال کے اس آخری کوّے کو اب مر جانا چاہیے۔ یہ مر جائے گا تو امن کے، ایمان کے، سچائی کے، محبت کے اور رشتوں کے پھول کھل سکیں گے۔ دعا کیجیے۔ خدا کے لیے دعا کیجیے کہ پیر پنچال کا یہ آخری کوّا کسی طور مر جائے۔

☆☆☆

نور شاہ

ایک لمحے کی جنت

دیکھئے!

لڑکی بے حد حسین ہو، کنول کے پھولوں جیسا گلاب رنگ چہرہ ہو، آنکھوں میں بے حد مستی ہو، آواز میں مٹھاس اور باتیں کرتے سمے پلکیں خود بخود جھک جاتی ہوں۔ تو کیا بے کیف اور بے رنگ زندگی میں محبت کی ایک، ہلکی سی حراست کا جذبہ پیدا نہ ہوگا......!

میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔

یوں تو میرا نام دینا ناتھ ہے لیکن سب ہی مجھے دینو کہتے ہیں، میری عمر شاید ۳۵ برس کی ہے، شاید اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں کب، کہاں اور کس کے یہاں پیدا ہوا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور میرے ناپختہ شعور میں کچھ سمجھنے اور کچھ پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو ماسٹر جی کے گھر میں پایا۔ یہ تو بعد میں مجھے ماسٹر جی سے معلوم ہوا کہ مجھے ایک ایسے گھر میں ایک ایسی عورت نے جنم دیا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری ماں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میرا باپ کون ہے۔ چار سال کی عمر تک وہ مجھے گھر گھر لیکر گھومتی رہی اور پھر ایک شام ناؤں سے تنگ آکر اور طعنوں کی تاب نہ سہہ کر مجھے ماسٹر جی کے دروازے پر چھوڑ گئی اور خود نہ جانے کہاں چلی گئی۔ مجھے اپنی ماں کی صورت بھی یاد نہیں۔ پھر ماسٹر جی کی تبدیلی ایک دوسرے دیہات میں ہوگئی، ان کے ساتھ میں بھی چلا آیا، دن کو میں اسکول کے دوسرے بچوں کے ساتھ پڑھتا لکھتا اور کھیلاتا، شام کو گھر میں ماسٹر جی کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا!

اب بھی میں ماسٹر جی کے ساتھ ہی ہوں، وہ اب شہر کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن چکے ہیں اور میں اسی ہائی اسکول کا چپراسی، اب میں فرصت کے لمحات میں صرف ناول پڑھتا ہوں ایسے ایسے ناول جن میں پیار و محبت کا ذکر ہو، عشق کی باتیں ہوں، لڑکیوں کی کہانیاں، ایسی کہانیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ میرے من کو بھاتی ہیں، نہ جانے

کیوں شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے حقیقی زندگی میں اب تک کسی عورت کو اپنے قریب نہ دیکھا، شاید میری اس حسرت کی کبھی تکمیل نہ ہوتی اگر مالا ہمارے اسکول نہ آتی اور میں اس روز ماسٹر جی کا کھانا بنانے کی بجائے اسکول میں نہ ہوتا، وہ تو دوسرا چپراسی چھٹی پر تھا۔ ماسٹر جی کی بھی اپنی عادتیں ہیں۔ ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں، جب شادی نہ ہوئی ہو تو عورت کہاں سے آئے گی اور پھر۔ یہ بات ابھی نہیں آگے چل کر بتاؤں گا۔ بڑی نازک سی بات ہے، بڑی راز کی بات ہے، شاید کسی کو میری بات پر یقین نہ ہو، کوئی یقین نا بھی کرے تو میرا کیا بگڑتا ہے، ماسٹر جی چاہتے تو کسی بڑے گھرانے کی خوبصورت سی لڑکی کا ہاتھ بڑی آسانی کے ساتھ تھام سکتے تھے کتنی ہی بار میں نے انہیں اشاروں ہی اشاروں میں کہا بھی لیکن وہ سب کچھ جان کر بھی انجان بنے رہے۔ اس کی بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ دیکھئے اب وہ راز کی بات آ ہی گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسکول بند ہونے کے بعد ماسٹر جی کا اکثر وقت گھر میں چند لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے گزر جاتا ہے۔ اب وہ شادی کریں تو کیسے ان کے پاس وقت ہی کہاں کہ بیوی سے پیار کی دو چار باتیں کریں۔ کچھ اس کی سنے اور کچھ اپنی سنائیں اور ہاں ان لڑکوں کو اس لیے نہیں پڑھاتے کہ بالائی آمدنی ہو اور یہ بھی سچ نہیں کہ وہ گھر میں ہر ایرے غیرے لڑکے کو پڑھاتے ہیں۔ بڑے سوچ وچار اور دیکھ ریکھ کے لڑکوں کا خود انتخاب کرتے ہیں۔ بہت دنوں تک تو میں نے اس بات پر بہت سوچا کچھ ناول بھی پڑھ ڈالے، شاید ان میں ہی کچھ لکھا ہوا مل جائے لیکن مایوسی ہوئی میں نے اسکول کے دو ایک استادوں سے اپنے طور پر پوچھا بھی وہ بس دبے دبے سے لہجے میں مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آخر ایک شام میں اس راز کی تہہ تک پہنچ ہی گیا۔ ماسٹر جی نے ایک لڑکے کو ٹھہرنے کے لئے کہا اور دوسرے لڑکوں کی چھٹی کر دی۔ میں نے سوچا لڑکا کسی مضمون میں کمزور ہوگا اور ماسٹر جی کچھ دیر کے لئے اور پڑھانا چاہتے ہوں گے لیکن پھر ......۔ کچھ ہی دیر بعد ماسٹر جی کی شادی نہ کرنے کی ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں!

اپنا تعارف تو میں پہلے ہی کرا چکا ہوں ماسٹر جی کے بارے میں بھی کچھ کچھ بتا چکا ہوں، اب ذرا بے حد حسین لڑکی کی کہانی سن لیجئے۔ مالا کی بات کر رہا ہوں وہ تو دوسرا چپراسی چھٹی پر گیا ہوا تھا اور میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے باہر اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ امتحانات ختم ہو چکے تھے اور نئے داخلے بھی قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اس

سلسلے میں کلاسوں میں خود جا کر کام کا جائزہ لے رہے تھے۔ (شاید نئے سال کے لئے لڑکوں کا انتخاب کر رہے تھے) حسب عادت میں ناول پڑھ رہا تھا ایک لڑکی کی محبت کی کہانی تھی وہ۔

''ہیڈ ماسٹر صاحب ہیں'' مٹھاس سے بھرپور ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا بس ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے سارے جہاں کی خوبصورتی ایک لڑکی کی روپ میں میرے سامنے آگئی ہو جیسے دور کسی ویرانے میں گھنگرو بج اٹھے ہوں۔ وہ لڑکی تو ان ناولوں کی لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''میں یہاں دینو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں۔''

''یہاں اپنے بھائی کے لیے آئی ہوں......اس کی ایڈمیشن کا مسئلہ ہے۔'' میں نے مڑ کر دیکھا، بارہ تیرا سال کا لڑکا کھڑا تھا، صاف شفاف قمیض اور نیکر پہنے۔ اپنی بہن کی شکل و صورت کا وہی چہرہ آنکھیں وہی دانت......سب کچھ ویسا ہی۔

''آپ کمرے میں بیٹھیں، ماسٹر جی آ ہی رہے ہوں گے''۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کو اس سکول میں پڑھنے کی اجازت مل سکتی ہے۔''

''داخلہ..................!!۔''

یہ کہہ کر پھر میری آنکھیں اس کے بھائی کی طرف اٹھیں، بڑا پیارا لڑکا تھا، ماسٹر جی کے معیار پر پورا اترتا تھا۔

''داخلہ تو یہاں بھی بند ہو چکا ہے لیکن میرا خیال ہے۔ نہیں میرا تجربہ بتاتا ہے کہ آپ کے بھائی کے لئے کوئی دقت نہ ہوگی۔ لڑکا اسمارٹ ہے خوبصورت ہے، ایسے لڑکوں کو ماسٹر جی پسند کرتے ہیں۔''

''پسند...کیا مطلب ہے۔''

''ایسے لڑکے اسکول کی شان بڑھاتے ہیں۔''

''ہاں میرا بھائی واقعی ذہین ہے، محنتی ہے۔''

اور ایسے میں ماسٹر جی آگئے، لڑکے کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔ ایک وحشیانہ پن! لڑکی نے فارم بھرا، ماسٹر جی نے اس پر کچھ لکھ دیا اور میری طرف

بڑھاتے ہوئے بولے ''یہ دفتر میں دے آؤ''

مجھے اچانک ان کتابوں سے نفرت سے ہونے لگی، یہ سب کتابی باتیں ہیں، کتابی کہانیاں ہیں حقیقی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے سوچا وقت گزارنے کے لیے کتابیں تو اچھی ہیں لیکن یہی وقت کسی لڑکی، کسی عورت کے قریب بیٹھ کر بھی تو گزارا جا سکتا ہے اور پھر میری عمر کا بھی تو یہی تقاضا تھا میں عجیب عجیب سی باتیں سوچنے لگا۔ مالا کتنی سندر ہے، اس کا بھائی بھی سندر ہے، ان کی ماں بھی ایسی ہی رہی ہوگی اور پھر دیکھتے دیکھتے سوچتے سوچتے اسکول میں پڑھنے والے جانے کتنے لڑکوں کی صورتیں میری نظروں کے سامنے پھر گئیں...... یہ اکمل ہے، اس کے گال پر ایک کالا تل ہے، کتنا اچھا لگتا ہے۔ یہ اجیت سنگھ ہے اس کے بال کتنے لمبے ہیں، یہ سلطان ہے، اس کے چلنے کا انداز لڑکیوں جیسا ہے...... شاید میں یہ سب نہ سوچتا اگر میں نے مالا کو نہ دیکھا ہوتا، مالا کو دیکھ کر مجھے زندگی کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے کئی بار مالا کو دیکھا، کچھ دن تک وہ اپنے بھائی کو اسکول چھوڑنے کے لیے آتی رہی۔ جب بھی ملتی کہتی ''کیسے ہو''۔

اور اس لمحے مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا ہوں! میں اپنی خوشی کا اندازہ اپنی اداسی سے لگاتا ہوں کہ بہت خوش ہوں، بہت کچھ پالیا ہے، میں اس دن بھی اپنی اُداسیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر نے بُلا کر کہا۔

''دینو، تم ذرا اشکتی کے ساتھ اس کے گھر تک جاؤ اور یہ خط اس کی بہن مالا کو دے آؤ''۔

میں نے حکم کی تعمیل کی، مالا گھر میں ہی تھی، میں نے خط دیا۔ اس نے پڑھ کر میری طرف دیکھا اور پھر اپنے بھائی کی طرف۔

''دینو مجھے کوئی اعتراض نہیں''۔

''جی کس بات کا'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''تم کچھ نہیں جانتے''۔

''کس بارے میں''۔

''ارے بھائی اس خط کے بارے میں''۔

اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ ''تم کھڑے کیوں ہو دینو، بیٹھ جاؤ...... یہاں اس کرسی پر''۔

پھر مالا نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھادی۔ اچانک میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھوگئیں۔اُف کیالمس تھاوہ،کیسی حرارت تھی وہ، مجھے لگا جیسے میرے سارے شریر میں ابھی ابھی ایک بھیانک آگ لگ گئی ہو۔

''اب ہر شام شکتی ہیڈ ماسٹر جی کے گھر پڑھنے کے لئے جایا کریگا۔شکتی جنرل نالیج میں ذرا کمزور ہے یہی تو لکھا ہے تمہارے ہیڈ ماسٹر جی نے اس خط میں......اور ہاں چند دنوں کے لئے تمہیں واپسی پر شکتی کے ساتھ آنا پڑے گا۔میری خاطر...... تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔''

وہ ساری رات میں نے جاگ جاگ کر کاٹی !اور میں بے حداُداس ہوگیا۔ماسٹر جی کی آنکھوں کی چمک تو میں نے اسی دن دیکھ لی تھی جب شکتی پہلی بار اسکول آیا تھا اس چمک میں اب شدت آگئی تھی۔اس دوران مجھے کئی بار مالا کے گھر جانا پڑا،کبھی شکتی کو چھوڑنے کے لیے اور کبھی لانے کے لیے،مالا سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہوجاتی۔ایک بات بتادوں مالا کو دیکھتے ہی مجھے ایسا لگتا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں چونٹیاں سی رینگنے لگتی ہوں۔مجھے ایک دم احساس ہوتا ہے کہ میں چپراسی ہونے کے ساتھ مرد بھی ہوں اور عمر کے اس دہلیز پر کھڑا ہوں جہاں ایک عورت کی ضرورت پڑتی ہے،اپنے شریر کی آگ بجھانے کے لیے، اپنے جلتے ہوئے دل پر ٹھنڈا پھاہا رکھنے کے لئے لیکن پھر میری وردی میری نظروں کے سامنے گھوم جاتی،چپراسی کی خاکی وردی؟

یہ آگ بجھانے کے لئے میں نے اب ہر اس عورت میں دلچسپی لینا شروع کردیا جو میری نظروں کے سامنے سے گزرجاتی۔ہاں یہی تو ہیں جو میرے شریر کی پیاس بجھاسکتی ہے۔لیکن میں ہمیشہ پیاسا ہی رہا!

میں نے کئی بار محسوس کیا،محسوس کیا کیا بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کی شکتی آتے ہی ماسٹر جی کسی کام کے بہانے مجھے گھر سے باہر بھیج دیتے ہیں ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا اور میں ایک دبی دبی سی مسکان بکھیرتا چلا جاتا تھا لیکن شکتی کی بات ہی دوسری تھی وہ مالا کا بھائی تھا اور مالا......؟

اس شام ماسٹر جی کسی میٹنگ میں مشغول تھے،شکتی ان کے کمرے میں انتظار کررہا تھا اور میں رسوئی گھر میں تپتی آگ کے سامنے کھانا بنارہا تھا ایک یہ آگ تھی جو میری ظاہری

بناوٹ کو جلا رہی تھی لیکن وہ آگ اس سے بھی زیادہ سخت تھی جو میرے من کے اندر تپ رہی تھی!

میں دھیمے دھیمے قدموں سے کمرے میں آ گیا۔

''شکتی۔''

''کیا ہے''

''میں.......... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''کہو، کہو، گھبرا کیوں رہے ہو۔''

'میں...... میرا مطلب ہے کہ.............!!''

اور میں خاموش ہو گیا، بے زبان ہو گیا اور اس خاموشی میں میری زندگی میں پہلی بار ایک ایسا لمحہ آیا، جنت ملی، ایک لمحے کی جنت، جب ایک سسکی ابھر کر ڈوب جاتی ہے؟ یہ سسکی شکتی کی تھی......!!

اب میرے جسم پر خاکی وردی نہیں، اس لئے کہ میں اب چپراسی نہیں رہا۔ یہ نوکری میں نے خود نہیں چھوڑی، ماسٹر جی نے مجھے نوکری سے برطرف کیا ہے اور گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ شاید مجھے پولیس کے حوالے بھی کرتے لیکن انہوں نے ایسا قدم نہیں اُٹھایا، مجھ پر رحم کھا کر نہیں بلکہ مجھ سے ڈر کر...... وہ جانتے ہیں اگر میری بے زبانی کو زبان مل گئی تو ان کی عزت...... ان کی زندگی کے کتنے ہی گھناؤنے راز میرے ذہن کی کتاب میں پوشیدہ ہیں.......... پر وہ پولیس میں رپورٹ بھی دیتے تو میری بات پر کون یقین کرتا۔

شاید کوئی بھی نہیں..........؟؟

☆☆☆

مخمور حسین بدخشی

عبداللہ دیوانہ

میں پاگل نہیں ہوں صاحب۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ خدا کے لئے آپ مجھے پاگل نہ کہیں، ورنہ میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔ ہاں صاحب میں ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔ آپ مجھے یہاں سے جانے دیجیئے اور بس۔ کیونکہ جب میں اس مینٹل ہاسپٹل کی ایک ایک کھڑکی پر نظر ڈالتا ہوں، ایک ایک دروازہ کی طرف دیکھتا ہوں، ایک ایک پاگل آدمی کی باتیں سنتا ہوں تو مجھے یہی احساس ہوتا ہے کہ میں پاگل ہوں۔ لیکن صاحب میں پاگل نہیں ہوں۔ اسلئے میں آپ کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔ حالانکہ اب مجھے یہاں سے نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر آپ مجھے یہ کہتے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ تو مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں ضرور پاگل ہوں۔ اگر آپ مجھے گھسیٹ کر یہاں سے نکال بھی دیتے۔ مجھے پھر بھی یہاں سے نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ اس لئے کہ اب اس ہاسپٹل کے باہر میرا کون ہے...... نہ کوئی گھر نہ کوئی بار...... نہ کوئی ٹھور نہ کوئی ٹھکانہ...... نہ کوئی باپ نہ کوئی ماں......، نہ بھائی نہ بہن اور نہ ہی کوئی دوست۔ پھر بھی یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں۔ کہاں؟ کس کے پاس رہوں اور کیا کروں۔ لیکن صاحب! یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بھی یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ بس جتنی جلدی آپ سے ہو سکے مجھے یہاں سے جانے دیا جائے۔ کیونکہ یہاں رہ کر یہ پاگل ہونے کا احساس...... صاحب میں یہاں رہ کر ضرور پاگل ہو جاؤں گا۔

اور ایک بات جو میں نے آپ سے ابھی تک نہیں کہی یہ ہے کہ اس کی آنکھیں بار بار میرے سامنے آجاتی ہے۔ اور یہی آنکھیں ہیں جو مجھے پاگل بنا دیتی ہیں۔ وہ آنکھیں ہے صاحب۔ یہ دیکھئے یہ اب بالکل میرے قریب آرہی ہیں۔ اوہ! یہ میری جان نکال کر رہیں گی۔ بچاؤ...... بچاؤ!! آپ نے مجھے پانی پلا دیا...... آپ نے ٹھیک کیا۔ اب وہ آنکھیں میرے سامنے نہیں ہیں...... بالکل نہیں ہیں۔ اور اب میں ہوش میں آگیا ہوں......!!

آپ میری باتیں مزے سے سن رہے تھے۔ لیکن جب وہ آنکھیں میرے قریب آ رہی تھیں تو میں بے ہوش ہو گیا۔ لیکن اب میں بالکل ہوش میں ہوں۔ اس لئے اب میں آپ سے سب کچھ کہوں گا۔ حالانکہ مجھے یہ سب کچھ آپ سے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ کیوں کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور ایک شریف آدمی ہو کر مجھے آپ سے سب کچھ نہ کہنا چاہئے۔ لیکن نہ جانے میں کیوں چاہتا ہوں کہ آپ سے سب کچھ کہوں۔ سب کچھ۔ کیوں کہ میرے سینے پر ایک بوجھ سا ہے۔ اور جب میں آپ سے یہ سب کچھ کہوں گا تو مجھے یقین ہے کہ یہ بوجھ ضرور ہلکا ہو جائیگا۔ اس وقت بھی جب سے آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا سا ہو رہا ہے، اور میں ذرا آزادی کے ساتھ سانس لینے لگ گیا ہوں......!

مجھے آپ سے سب سے پہلے یہ کہنا چاہیے کہ میری کوئی بہن تھی اور نہ کوئی بھائی۔ بس ایک باپ تھا اور ایک ماں۔ لیکن میں پانچ سال کا تھا جب کہ میری ماں مر گئی تھی۔ مجھے اب بالکل یاد نہیں کہ میری ماں کیسی تھی اور وہ کیسے مر گئی۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ پانچ سال کے بچے کا ذہن کیسا ہوتا ہے......لیکن پھر بھی نہ جانے مجھے یہ کیوں یاد آتا ہے کہ وہ مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ اور اس پیار کی یاد مجھے اس وقت اور زیادہ ستاتی تھی۔ جب میں چچا کے گھر میں آ گیا تھا۔ ماں کے مر جانے کے بعد میرے باپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ اسے دوسری شادی کرنی چاہیے تھی۔ اس لئے کہ اس کی عمر اس وقت صرف تیس سال کی تھی۔ اور تیس کی عمر آپ جانتے ہیں کہ کوئی زیادہ نہیں ہوتی۔ لیکن میرے باپ نے اس تیس سال کی جوان عمر میں بھی شادی نہیں کی۔ صرف اس لئے کہ کہیں دوسری ماں مجھے اس سے چھین نہ لے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ میرے باپ کو بھی مجھ سے کتنی محبت تھی۔ لیکن اسے کیا پتہ تھا اگر دوسری ماں مجھے اس سے چھین نہیں سکتی لیکن موت تو چھین سکتی ہے۔ اس بات کا علم شائد میرے باپ کو نہیں تھا۔ لیکن صاحب۔ ایک روز ایسا ہوا اور میرا باپ اس وقت مر گیا جب کہ میری عمر ابھی صرف نو سال کی تھی۔ یعنی پانچ سال کی عمر میں ماں مر گئی اور نو سال کی عمر میں باپ۔ آپ غور سے میری باتیں سن رہے ہیں نا؟

نو سال کی عمر کا یہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دس روز تک میرا باپ بستر میں پڑا رہا۔ اور جس روز وہ مر گیا۔ اس کے مرنے سے ذرا پہلے کی یہ بات اِس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ مرنے سے پہلے میرے باپ نے صرف مجھے اور اپنے بھائی یعنی چچا کو

اپنے کمرے میں رہنے دیا...... اور میرے ہاتھ کو اس کے ہاتھ میں یعنی میرے چچا کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ اسے میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہی ایک بیٹا اس دنیا میں میرا سب کچھ تھا۔ مال بھی اور دولت بھی......، یہ کہتے کہتے میں نے دیکھا کہ میرے باپ کی آنکھوں میں بہت سارے آنسوں آگئے۔ اور پھر اس نے ایک بار زور سے مجھے اپنی چھاتی سے لپٹ لیا۔ میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور میرے چچا کی آنکھوں میں بھی آنسوں تیر رہے تھے۔...... مگر مچھ کے یا......؟ لیکن نہیں۔ بھائی کی موت پر بھائی کے آنسو لازمی اور فطری ہیں۔ البتہ چچا اور بھتیجے کی بات الگ ہے۔

لیکن چچا کے گھر میں چند ہی روز رہنے کے بعد میں نے ایسا محسوس کیا کہ ماں اور باپ کے مرنے کے بعد میری بھی موت واقع ہوئی ہے۔ اور یہ جیتے جی کی موت بڑی دردانگیز ہوتی ہے۔ اور اس درد کو میں محسوس کر سکتا ہوں آپ نہیں۔ کیونکہ جانے وہی جس پر بیت جائے۔ لیکن مجھے اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ میرا چچا اپنے بھائی یعنی میرے باپ کی طرح بہت شریف آدمی تھا۔ اور پہلے چند روز تک اس نے مجھے ماں اور باپ کی موت کو محسوس ہی نہ ہونے دیا۔ وہ مجھے اس محبت سے کھلاتا پلاتا اور پیار کرتا کہ مجھے یہ خیال ہی نہ رہا کہ میری کوئی ماں بھی تھی جو مجھے پیار کرتی تھی اور میرا کوئی باپ بھی تھا جو میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ لیکن صاحب پتھر بھی بار بار کی رگڑ سے گھس جاتا ہے۔ اور چند ہی روز کے بعد میرا چچا وہ نہیں رہا جو کہ وہ پہلے تھا۔ چچی کے بار بار کے سکھانے سے وہ بدل ہی گیا۔ لیکن مجھے اس کا گلہ ہی کیا۔ وہ میرا باپ نہیں تھا جس نے میرے آرام میں خلل پیدا ہونے کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ تو میرا چچا تھا اور وہ اپنے بھتیجے کے واسطے چچی کو طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن میں ایک بار پھر اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میرا چچا اپنے بھائی یعنی میرے باپ کی طرح ایک شریف آدمی تھا۔ اس نے اکثر میری وجہ سے چچی کے ساتھ لڑا بھی۔ اس کے گریباں کو نوچ بھی لیا اور اس کی ہڈی پسلی کو ایک بھی کر دیا...... لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ چچا بدل گیا اور اپنے بھتیجے کو بالکل ہی بھول گیا۔ اس قدر بھول گیا کہ اب اس کے اپنے بچے سکول میں پڑھتے رہتے تھے اور اسکا بھتیجا جھاڑ دیتا اور برتن مانجھتا پھرتا تھا۔ اس کے اپنے بچے سکول سے واپس آکر کھیلا کرتے تھے اور اس کا بھتیجا بازار سے سودا سلف لاتا اور بازار کے نل سے دِن بھر پانی بھر بھر کر لاتا۔ اور اس کے عوض اسے کیا ملتا تھا۔ روٹی کے چند

سوکھے ٹکڑے اور باسی چاول کے چند نوالے...... ۔لیکن اس پر بھی بھتیجے نے کبھی چچا سے شکایت نہیں کی۔ اس پر بھی بھتیجے نے چچی کے ظلم کی داستان کسی سے بیان نہیں کی۔ لیکن اس وقت میں آپ سے یہ سب کچھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اب میرا کلیجہ پھٹنے کو آرہا ہے اور آپ سے یہ سب کچھ کہتے ہوئے میں اس درد اور جلن میں کچھ کمی سی محسوس کر رہا ہوں۔

ہاں تو میں آپ سے چچا اور چچی کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ پورے چار سال تک میں چچا اور چچی کے ظلم وستم سہتا رہا۔ کئی بار تکلیفوں کو سہتے سہتے میں نے سوچا کہ میں خودکشی کروں۔ کسی دریا میں چھلانگ مار کر غائب ہو جاؤں، کسی چھت پر سے گر کر اپنی جان دیدوں، کسی موٹر کے نیچے آجاؤں۔ لیکن نہ جانے میں ایسا کیوں نہ کر سکا۔ اور مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا...... دراصل میں بزدل ہوں صاحب...... ۔ میں یہ خیال کرتا تھا کہ اگر دریا میں چھلانگ مارنے کے بعد مجھے دریا سے نکالا گیا تو میں چچا کو کونسا منہ دکھاؤں گا۔ اب آپ کہیں گے کہ جب میری عمر تیرہ سال کی تھی تو میں اس ظلم وستم سے بچنے کے لئے چچا کے گھر سے بھاگ کیوں نہ گیا۔ صاحب......! یہ خیال بھی کئی بار میرے ذہن میں آیا تھا اور اکثر آیا تھا۔ لیکن میں ایسا بھی نہ کر سکا۔ کیوں کہ میں اپنے باپ کی طرح ایک شریف آدمی ہوں۔ اور ایسا کام مجھ سے کبھی نہیں ہوا جس میں کہ شرافت کی بات نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں چچا کے گھر سے بھاگ نہیں گیا۔ تاکہ کہیں لوگ میرے چچا سے یہ نہ کہے کہ اِس کا بھتیجا اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر اس کے گھر سے بھاگ گیا۔ اس بات سے آپ کو یقین آگیا ہوگیا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہی شرافت میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسی شرافت نے مجھے چچا کے ظلم وستم سہنے پر مجبور کیا اور اس کے گھر سے نکلنے نہ دیا۔ یہی شرافت ہے جس نے مجھے راجی سے دور کیا اور یہی شرافت ہے جس نے آج مجھے اس مینٹل ہاسپٹل تک پہنچا دیا......!

لیکن پہلے آپ راجی کی بات رہنے دیں۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تیرہ سال کی عمر میں مجھے چچا کے گھر سے چھٹکارا کیوں کر حاصل ہوا...... اور کیسے میں ایک مدت تک ایک ایسی دنیا میں رہا جہاں مجھے ایک بار پھر ماں کی موت کی یاد نہیں آئی۔ باپ کی جدائی نے نہ ستایا اور چچا اور چچی کے ظلم وستم کا خیال نہ آیا۔ ۔ ایک روز ایسا ہوا کہ چچا جب

شام کو گھر آیا تو پہلے وہ بہت دیر تک ایک الگ کمرے میں چچی کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہاں وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ لیکن اتنا مجھے ضرور یاد ہے کہ جب وہ کمرے سے باہر آ گئے تو دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی ان نظروں سے ہی میں بھانپ گیا کہ وہ میرے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔ پھر چچا نے اپنے پاس بٹھایا، اور کہا...... بیٹا مجھے یاد ہے کہ تیرے باپ نے اس غرض سے تمہیں میرے سپرد کیا تھا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے آج تک ہر ممکن کوشش کی کہ تمہیں کسی بھی قسم کی تکلیف کا احساس نہ ہو۔ اور تمہارے باپ کی روح کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ لیکن بیٹا! چونکہ مجھے ہر وقت تمہاری بھلائی ہی کا خیال رہا ہے۔ اسی لئے میں تمہیں کل ایک ایسی عورت کے پاس لے جاؤں گا جو تمہیں اپنے بیٹے کی طرح پالے گی۔ اچھا کھانے کو ملے گا۔ اچھا پہننے کو دے گی۔ کیونکہ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔

بیٹا......! بیگم افتخار الدین بڑی دولت مند ہیں۔ اور میں خوش ہوں کہ تمہارے نصیب اب جاگ گئے ہیں۔ تمہیں دور کرتے ہوئے مجھے دکھ ضرور ہوگا، لیکن تمہیں ایک دولت مند گھر میں بڑھتے، پلتے، کھاتے، پیتے اور انسان بنتے دیکھ کر مجھے بے پناہ خوشی بھی نصیب ہوگی۔ اور اس طرح شاید تمہارے باپ کی روح بھی مجھ سے خوش رہے گی۔ یہ کہہ کر چچا خاموش ہو گیا اور ایک بار پھر چچی کے ساتھ الگ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ اس روز مجھے یاد ہے کہ میں رات بھر روتا رہا۔ رات بھر میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ لیکن یہ آنسوں خوشی کے آنسو تھے۔ لیکن صاحب! یہ اس بات کی خوشی نہ تھی کہ اب میں چچا کے گھر سے نکل کر بیگم افتخار الدین کے بنگلے میں قدم رکھنے والا تھا۔ اب میں جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہونے والا تھا۔ نہیں صاحب، یہ خوشی اس بات کی نہ تھی۔ البتہ خوشی اس بات کی تھی کہ آج پہلی بار چچا نے مجھے بیٹا کہہ کر پکارا تھا۔ بہت مدت تک میں اس ایک لفظ کے لئے ترس رہا تھا کہ کوئی مجھے بیٹا کہہ کر پکارے، کوئی میرا باپ بنے، کوئی مجھے ماں کا پیار دے اور کوئی میرے کانوں میں محبت کے دو بول کہہ دے۔! آج میرے چچا نے میری یہ تمنا پوری کی تھی۔ اسی لئے میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ آج میں چاہتا تھا کہ میں چچا سے کہدوں۔ چچا میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ چچا مجھے دولت کی نہیں محبت کی ضرورت ہے۔ میں روکھی سوکھی پر ہی گزارا کروں گا مگر تم مجھے بیٹا کہہ کر پکارا کرو۔ چچا۔ چچا تم مجھے بیٹا کہہ کر

پکارا کرو۔ مگر صبح پو پھٹنے کے ذرا بعد ہی جب چچا میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ باہر لے آیا تو میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حالانکہ میں نے ساری رات رو رو کر یہ سوچ لیا تھا کہ میں چچا سے کہہ دوں کہ میں اس گھر سے نہیں جاؤں گا۔ لیکن صاحب یہاں بھی میری شرافت نے میرا منہ بند کر دیا۔ مجھے یہ خیال آیا کہ چچا جو چاہے کرے مجھے اس کی مرضی میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ اس لئے میں چپ چاپ اس کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ چل دیا۔

یہاں چچا کے گھر سے تقریباً دو ڈھائی میل دور ہم رانی باغ پہنچے۔ رانی باغ یقیناً پاش کالونی ہے کہ یہاں کچی اینٹوں کے بنے ہوئے بوسیدہ مکان نہیں، بلکہ پتھر، سیمنٹ اور لوہے سے بنے ہوئے شاندار محلات کھڑے ہیں۔ اور یہ شریفوں کی بستی ہے۔ انہیں محلات میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک محل میں داخل ہوئے۔ اندر میرے قدم بڑی احتیاط کے ساتھ پڑ رہے تھے کیونکہ یہ دنیا ہی میرے لئے اجنبی تھی۔ اس دنیا کا تصور تک میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اسی دنیا میں آ کر میں خود سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا اس میں کچھ حقیقت بھی تھی؟ لیکن صاحب...... میں یہ جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا، یہ حقیقت ہی تھی کوئی خواب نہ تھا۔ چچا نے مجھے ایک بڑے سے ہال میں بیگم افتخار الدین سے ملا دیا۔ اس بڑے سے کمرے میں سرخ ایرانی قالین بچھے تھے۔ کھڑکیوں پر پھول دار ریشمی پردے ہوا میں جھول رہے تھے اور بیگم افتخار الدین کرسی پر بیٹھی ریڈیو سن رہی تھیں۔ اس نے ہم دونوں کو بیٹھنے کو کہا۔ اور پھر چچا کی طرف مخاطب ہوئیں۔ ''تو آپ آج اسے لے ہی آئے''۔ اور پھر میری طرف غور سے دیکھنے کے بعد مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ بڑا ذہین اور شریف لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر چند رسمی باتیں کرنے کے بعد چچا مجھے اس گھر میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیوں کہ اس روز کے بعد میں نے چچا کو کبھی نہیں دیکھا۔۔۔۔!

نئے گھر میں پہلی رات کو میں بالکل سو نہ سکا۔ حالانکہ مجھے اچھی نیند آ جانی چاہیے تھی۔ کیوں کہ کھانا پہلی بار پیٹ بھر کے کھایا تھا اور لذیز کھایا تھا۔ بستر بھی نرم اور گرم تھا اور سب کچھ ایک خواب کا سا عالم تھا۔ لیکن میں پھر بھی سو نہ سکا۔ کیونکہ دماغ میں عجیب عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔ کیا چچا نے اس عورت سے میرا سودا کیا ہے؟ کیا بیگم افتخار الدین مجھے بیٹے کی طرح ہی پالے پوسے گی......؟ آخر اسے کیا ضرورت پڑ گئی کہ مجھ ہی کو چچا سے

مانگ لیا۔ جس کی نہ کوئی تعلیم ہے اور نہ کوئی تہذیب۔ کیا چچا مجھے یہاں دھوکے سے تو نہیں لے آیا۔؟ کیا بیگم افتخار الدین مجھے دھوکا تو نہ دے گی۔؟ یہ اور اس قسم کے بے شمار سوالات رات بھر میرے ذہن میں کھلبلی مچاتے رہے اور میں رات بھر سو نہ سکا، لیکن صاحب! چند ہی روز گزر جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جو کچھ بھی میں سوچ رہا تھا وہ سب غلط ہے۔ نہ چچا نے مجھے دھوکا دیا ہے اور نہ بیگم افتخار الدین کو مجھے دھوکا دینے کا کوئی خیال ہے۔ کیونکہ جس لگاؤ جس پیار کے ساتھ وہ مجھ سے پیش آتی تھیں اس لگاؤ اس محبت و پیار پر شک کرنا اپنے آپ کو جان بوجھ کر گناہ گار بنانا تھا۔

بیگم افتخار الدین کی عمر کوئی پینتیس سال کے قریب تھی۔ اس نے تیسری شادی نہیں کی تھی۔ کیونکہ جب اس نے پہلی شادی کی تھی تو اس کے خاوند نے تین ہی سال بعد اس کو چھوڑ دیا تھا۔ اور جب اس نے دوسری شادی کی تو دو ہی سال بعد اس کا دوسرا خاوند مر گیا۔ لیکن یہ دوسرا خاوند اپنے پیچھے کوئی اولاد چھوڑنے کے بجائے بیگم افتخار الدین کے لئے ایک سلک فیکٹری اور بے شمار دولت چھوڑ گیا تھا۔ اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ بیگم افتخار الدین نے تیسری شادی کیوں نہیں کی تھی اور دو شادیاں کرنے کے بعد بھی اس کی اپنی کوئی اولاد کیوں نہیں تھی؟

بیگم افتخار الدین کے گھر میں رہ کر پہلے پہل میں خود کو اجنبی سا محسوس کرنے لگا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ بیگم افتخار الدین کی محبت اور خلوص نے اس اجنبیت کو مٹا دیا۔ میری عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی اور جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا ہے کہ تیرہ سال کی عمر تک نہ میں نے کچھ لکھا تھا اور نہ کچھ پڑھا تھا۔ اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی ہنر ہی حاصل کیا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک گنوار کے روپ میں بیگم افتخار الدین کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ لیکن صاحب! آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ بیگم افتخار الدین نے کبھی بھی میرے اس گنوار پن کو دیکھ کر منہ نہیں بنایا۔ اپنی عمر کو برباد کرنے کا طعنہ نہیں دیا۔ بلکہ میری اس بربادی کو اس نے حالات کا تقاضہ سمجھ کر مجھ میں مستقبل کو روشن کرنیکا ایک جذبہ اور احساس پیدا کیا۔ اب روز ایک استاد مجھے پڑھانے کے لئے آتا تھا اور باقی تہذیب و اخلاق کے متعلق جتنی بھی باتیں تھیں وہ بیگم افتخار الدین روز صبح سے شام تک میرے ذہن نشین کرتی جاتی تھیں اور ان پہ چلنے اور عمل کرنے کے لئے کہتی تھیں۔ اگر کہیں پر کوئی غلط بات منہ سے نکلتی یا کوئی بھونڈی

حرکت سرزد ہوتی۔ تو اسے بہت غصہ آجاتا تھا۔ لیکن اس غصہ میں بھی کتنا پیار ہوتا تھا، کتنی محبت ہوتی تھی اور کتنا خلوص ہوتا تھا۔ اسے میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اس کی اس طرح کی پرورش، اس طور کی دیکھ بال اور اس انداز کی محبت کو دیکھ کر یہی محسوس کرتا تھا کہ بیگم افتخار الدین کو میرا اس قدر خیال ہے کہ اگر میری اپنی ماں زندہ ہوتیں تو شاید ہی اسے میرا اتنا خیال ہوتا۔ وہ میری سب کچھ تھیں کیونکہ میرا اس دنیا میں اور تھا ہی کون۔ اور نہ میں چاہتا تھا کہ میرا اس دنیا میں کوئی ہو۔ کیونکہ مجھے بیگم افتخار الدین جو مل گئیں تھیں۔ ذراسی چھینک آئی تو بیگم افتخار الدین نے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا اور ڈاکٹر حاضر۔ اور پھر کھانے پینے کی چیزوں میں تبدیلی آئی۔ چہرا ذرا سا زرد پڑ گیا تو ٹانک پر ٹانک حاضر اور نوکروں کو تلقین کہ یہ چیز اس وقت دینی چاہیے اور یہ چیز اس وقت۔ کبھی پاؤں میں ہلکی سی چوٹ بھی آئی تو بیگم افتخار الدین کی پریشانیوں کی حد نہیں ہوتی تھیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے، جن ہاتھوں نے کبھی کوئی کام کرنا ہی نہ سیکھا تھا، میری مرہم پٹی کرتی تھیں۔ یہ تھیں بیگم افتخار الدین اب آپ ہی کہیے کہ اگر میری اپنی ماں زندہ ہوتیں تو وہ میرے لئے اتنا کچھ کر سکتی۔ جتنا کہ یہ فرشتہ سیرت عورت میرے لئے کرتی تھیں۔؟

اسی دولت، اسی راحت اور اسی جنت میں مجھے راجی بھی ملی۔ راجی کا نام میں نے پہلے بھی لیا تھا......لیا تھا نا۔؟ ہاں صاحب! راجی اس مالی کی لڑکی کا نام ہے۔ جو بیگم افتخار الدین کے باغیچے میں نئے نئے پھول اگاتا تھا۔ اور ان کی پیاری پیاری کیاریاں بنایا کرتا تھا۔ اس کی راجی بھی ایک پھول تھی۔ ویسی ہی رنگیں، ویسی ہی خوبصورت اور ویسی ہی نازک کہ یہ احساس ہوتا تھا کہ ہاتھ لگاؤ تو ابھی مرجھا جائے گی۔ اس میں خوشبو ہی خوشبو تھی۔ بالکل ایسی ہی خوشبو جیسی یاسمین کے پھولوں میں ہوتی ہے۔ راجی دن میں باپ کے لئے کھانا بھی بناتی تھی، پھولوں کو پانی دینے میں بھی باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی اور مجھ سے بھی کبھی کبھی کھیلا کرتی تھی اور باتیں کیا کرتی تھی۔ کسی کسی وقت اس لئے کہ کبھی اسے فرصت ہوتی تو مجھے نہیں اور کبھی مجھے فرصت ہوتی تھی تو اسے نہیں۔ لیکن جس وقت بھی ہم دونوں کو فرصت ہوتی تو ہم اس وقت کا خوب فائدہ اٹھاتے تھے، خوب کھیلا کرتے تھے۔ اور خوب باتیں کیا کرتے تھے۔ راجی کی عمر بھی قریب قریب میرے ہی برابر تھی یا مجھ سے ایک دو سال کم۔ لیکن سال دو سال کا فرق کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ شائد یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے

بہت گھل مل گئی تھی اور مجھے بھی اس سے گھل مل کر باتیں کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ صاحب! راجی باتیں بڑی پیاری پیاری کرتی تھی۔ ایسی پیاری پیاری جیسے کوئی بلبل چہک رہی ہو۔ لیکن صاحب! جب دن گزرتے گئے۔ بہت سارے دن۔ بہت سارے مہینے اور کئی برس یعنی یہی کوئی چار برس۔ میں سترہ سال کا ہوگیا۔ راجی بھی پندرہ سال کی یا اس سے کچھ کم کی ہوگئی۔ وہ بھی جوان ہوگئی، اور میں بھی جوان ہوگیا تو مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ راجی کی زلفوں کی خوشبو تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے، اس کی معصوم آنکھوں کی معصومیت بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی باتوں کی چہچہاہٹ شیریں سے شیریں بنتی جا رہی ہے۔ جب مجھے یہ سب کچھ نظر آیا تو راجی ہر وقت میری نظروں میں سماتی رہی۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر چار پہر آنکھیں اس کی جھونپڑی پر لگی رہنے لگیں۔ جب اس کی صورت دکھائی دیتی تو دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ جب سامنے آجاتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ یہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب وہ میرے سامنے آجاتی تھی تو میرے بازو چاہتے تھے کہ اسے بازوؤں میں جکڑ کر ہی رکھا جائے۔ دل چاہتا تھا کہ اسے دل کے ساتھ ہی لگا کر رکھنا چاہیے اور آنکھیں چاہتی تھی کہ اسے آنکھوں سے ہی لگائے رکھنا چاہئے۔ یہ میری حالت تھی۔ اور راجی کی حالت بھی اس سے کچھ کم نہ تھی۔ وہ جب بھی میرے سامنے آتی، تو اس انداز سے آتی اور میری طرف یوں دیکھتی کہ اس کے نازک بدن کا ایک ایک انگ اور اس کی شرمیلی نگاہوں کی ایک ایک جنبش مجھ سے یہ فریاد کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔
''عبداللہ! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ تم کب سمجھ جاؤ گے عبداللہ۔ جب میں مر جاؤں گی تب نا؟ محبت بار بار نہیں ہوتی۔ ایک بار ہوتی ہے۔ یہ لو اس وقت میں تمہارے سامنے ہوں۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لو۔ مجھے اپنے دل میں بسا لو۔ مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لو۔ کیونکہ میں پھر نہیں آؤں گی......''۔ جب مجھے راجی کے جسم کا ایک ایک انگ اور ایک ایک روم اور اس کی خاموش نگاہوں کا ایک ایک اشارہ یہی فریاد کرتے ہوئے دکھائی دیا۔ تو صاحب! میں پیار کے عالم میں مبتلا ہوگیا۔ ایک کش مکش سی تھی جو میری روح کو جلائے جا رہی تھی۔ ایک کھٹک سی تھی جو میرے جگر میں پھانس بن کر اٹک کر رہ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور سوچ سوچ کے پریشان ہوتا رہتا کہ یہ راجی کو کیا ہو گیا ہے اور یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ اگر کسی نے مجھے راجی سے چھپ چھپ کر باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تو؟ اگر راجی نے کہا۔ عبداللہ مجھے

اپنا بنالو تو ؟ یہ اور اس قسم کے خیالات نے جب مجھے لگاتار پریشان کیا تو صاحب ! آپ کو معلوم ہے میں نے کیا کیا۔؟ میں ایک دن راجی سے ملا۔ وہ پھولوں کی ایک کیاری کے پاس بیٹھی گھاس پھونس نکال رہی تھی کہ جب اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو اس کے رخساروں پر لالی سی ابھر گئی اور اس کی شرمیلی سی نگاہوں میں ایک شرمیلی شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس وقت اسے دیکھ کر پھر میرے دل کی وہی حالت ہو رہی تھی جو کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ ایک بار پھر میرے بازو مجھے راجی کو اپنے سینے سے لگا لینے پر اکسا رہے تھے۔ ایک بار پھر مجھے راجی کی معصوم سی نظریں پکار پکار کر کہتی دکھائی دیتی تھیں۔ عبداللہ تم کب سمجھو گے؟ عبداللہ تم سمجھتے کیوں نہیں؟ کیا تب سمجھو گے جب میں مر جاؤں گی۔؟ لیکن صاحب جب میں راجی کے قریب گیا تو میں نے اپنے جذبات و احساسات کو قابو میں رکھتے ہوئے راجی سے کہا۔"

"راجی بہن......"۔ راجی نے ایک لمحہ کے لئے میری طرف دیکھا۔ ایک کپکپی سی اس کے بدن میں پیدا ہوئی اور پھر اس کی نظریں نیچے جھک گئیں۔ میں نے پھر کہا۔"راجی میں تمہارا بھائی ہوں اور تم میری بہن ہو......"۔ اب کی بار میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی ہے اور وہ میری طرف ایک نظر کئے بغیر ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دوڑ کر کہیں غائب ہو کر رہ گئی۔ یہ میری شرافت ہے صاحب !۔ اور اب آپ کو شاید اس بات کا پورا یقین آ گیا ہوگا کہ ایک مکمل شریف آدمی ہوں۔ لیکن صاحب !۔ اب جب کہ راجی کا تذکرہ چھڑ ہی گیا تو مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ اس ملاقات کے بعد یعنی جب میں نے راجی کو بہن بنالیا، راجی کو میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اب راجی وہ راجی نہ تھی جو کہ پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں شرماہٹ نہیں افسردگی ہوتی تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں مایوسی ہوا کرتی تھی اور اب میں اپنی شرافت کو کبھی اور کسی حالت میں بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو سزا دی۔ مگر راجی کو بہن بنالیا اور اپنی شرافت کو بچالیا۔ اب وہ مجھ سے بات نہ کرتی۔ اب وہ مجھے دیکھ کر بے رخی سے مڑ جاتی۔ آپ ہی کہیے صاحب مجھے کیا تھا۔؟ صاحب ! پھر ایک روز راجی اپنے گاؤں چلی گئی اور وہی اس کی شادی بھی ہو گئی۔ اور اب میں سن رہا ہوں کہ اس کی گود میں اب ایک خوبصورت بچہ کھیل رہا ہے۔ لیکن میں نے اس کے گاؤں چلے جانے کے بعد نہ اسے دیکھا اور نہ اس کے بچے کو۔ خیر مجھے کیا کرنا تھا؟ لیکن صاحب ! ایمان کی بات ہے کہ مجھے راجی کے ساتھ

بہت کچھ تھا۔ مجھے اس کی پاکیزگی یاد آتی ہے اور اس کی باتیں یاد آتی ہیں جن میں بلبل کی سی چہچاہٹ بسی ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں مجھے ایک انسان کی حیثیت سے یاد آجانا چاہیئے تھیں۔ اس لئے مجھے اب بھی یاد آرہی ہیں۔ ورنہ کہاں اب راجی اور کہاں میں۔ لیکن اس وقت بھی مجھے بیگم افتخار الدین کی یہ بات یاد آتی ہے کہ حسن جہاں بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو زندہ رہتا ہے۔ راجی بھی حسن کا ایک مجسمہ تھی۔ اس کی باتوں میں بھی حسن تھا۔ اس کے بدن میں بھی حسن تھا۔ اس کی زلفوں میں بھی حسن تھا۔ اس لئے راجی کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا میرے دل اور میرے ذہن میں زندہ ہے۔ حسن ہر حال میں زندہ رہتا ہے صاحب......!

لیکن صاحب......! مجھے معاف کریں کیونکہ میں نے آپ کو پہلے اپنے ماں باپ کا دکھڑا سنایا۔ پھر چچا اور چچی کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی اور پھر راجی کی بات چھیڑی۔ لیکن اصل بات جو ہے وہ نہ میں نے کہی اور نہ آپ نے سنی۔ لیکن یہی وہ بات ہے جس نے مجھے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔ میری یہ حالت بنا دی ہے اور مجھے اس مینٹل ہاسپٹل میں پہنچا دیا۔ اور اب آپ کے سامنے اپنی رسوائی بیان کرنے پر بھی مجبور ہو رہا ہوں۔ ورنہ صاحب! میں اٹھارہ سال کی عمر تک بھی بات کرنا نہ جانتا تھا۔ اور بیگم افتخار الدین بھی اس بات پر مجھ سے اکثر بگڑ بیٹھتی تھی کہ میں کھل کر باتیں نہیں کرتا ہوں، اور لڑکیوں کی طرح شرماتا ہوں۔ خیر یہ میری کمزوری تھی یا شرافت کی دلیل کہ میں لڑکیوں کی طرح شرماتا تھا یا کھل کر باتیں نہیں کرسکتا تھا......لیکن آج یہ دونوں باتیں مجھ سے رخصت ہوگئی ہیں۔ اب میں آپ کے سامنے کھل کر باتیں بھی کرتا ہوں اور لڑکیوں کی طرح شرماتا بھی نہیں ہوں......!

ہاں تو صاحب! میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اصل بات کونسی تھی جس نے مجھے اس حالت میں پہنچا دیا۔ صاحب! آپ نے ابھی میری زبان سے سنا کہ بیگم افتخار الدین کو میری پرورش، میری دیکھ بھال اور میرے مستقبل کا کتنا خیال تھا۔ اور یہ اسی پرورش، اسی دیکھ بھال اور اسی خیال کا نتیجہ ہے کہ آج میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ میں کسی مہذب سے مہذب سوسائٹی میں بیٹھ کر ان سے کسی مسئلے پر بات کرسکتا ہوں۔ اور آج میری صحت بھی اس قدر اچھی ہے کہ کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ اس نے بچپن میں سوکھی روٹیوں

کے چند ٹکڑوں پر گزارا کیا ہوگا۔ اور یہ جو کچھ بھی آپ مجھ میں دیکھ رہے ہیں یہ سب کچھ بیگم افتخار الدین کا دیا ہوا ہے۔ اس کے لئے میں بیگم افتخار الدین کا شکر گزار ہوں۔ لیکن صاحب! ایک روز ایسا ہوا اور یہ صرف آج سے دو روز پہلے کا واقعہ ہے۔ جب ہمارے بنگلے میں سفیدی کی جارہی تھی۔ اس روز ہمارے ہاں بہت سارے مزدور تھے اور کام شام تک ہی ختم ہوگیا تھا۔ لیکن صاحب! جب میں رات کو اپنے کمرے میں سونے کے لئے گیا تو مجھے رات کے بارہ بجے تک نیند نہیں آرہی تھی۔ کیونکہ سفیدی کرنے کی وجہ سے سارے کمرے میں ایک عجیب سی بو پھیل گئی تھی۔ میں نے لائٹ آف کی اور سردی کا موسم ہوتے ہوئے بھی کھڑکیاں کھلی رہنے دی۔ اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند کو آنا تھا نہ آرہی تھی۔ لیکن صاحب! اچانک میرے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھل گیا اور کھڑکیوں سے آتی ہوئی دھیمی دھیمی چاندنی میں مجھے بیگم افتخار الدین کی صورت نظر آئی۔ وہ میرے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور ایک ایسی آواز میں' جو کہ میرے لئے بالکل اجنبی تھی، دھیرے سے بولی۔ ''عبداللہ......'' ! میں نے بغیر اٹھے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ابھی کھڑکیاں بند کر دیتا ہوں۔ میں تو ابھی سویا نہیں ہوں۔ بس ذرا چاندنی دیکھ رہا تھا۔ !'' بیگم افتخار الدین اور میرے قریب آگئی اور میری طرف دیکھ کر پھر اسی دھیمی آواز میں بولیں۔ ''ہاں آج بڑی اچھی چاندنی ہے عبداللہ......!''۔ میں نے اس کی سانسوں کو محسوس کیا تو ان میں ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ ایک عجیب سی وحشت ...... ایک عجیب سی وحشت صاحب......!۔ میرے سارے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ میں لرز اُٹھا۔ میں چلایا۔ اور پھر مجھے معلوم نہیں کہ اس رات اور کل دن میں کہاں کہاں رہا۔ کیا کرتا رہا۔ کیا کہتا رہا اور مجھے یہاں کون لے آیا؟ ان سب باتوں کا مجھے کوئی علم نہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ اس رات سے لے کر کل دن تک میں کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن کیا کہہ رہا تھا۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ وہ آنکھیں بار بار میرے سامنے آجاتی تھیں اور میں اتنا لرزتا اور ڈرتا تھا کہ مجھے یاد نہیں رہتا کہ میں کیا کہتا ہوں۔ وہ آنکھیں عجیب سی آنکھیں تھی صاحب ...... یہ دیکھئے وہ آنکھیں پھر سے میرے قریب آرہی ہیں۔ اب بالکل قریب آرہی ہیں۔ اوہ! یہ آنکھیں میری جان نکال کر رہیں گی......بچاؤ! بچاؤ......!!

☆☆☆

شبنم قیوم

چھٹکارا

اپنے ہی خیالوں میں بلوارڈ کی طرف جارہا تھا۔ آسمانی رنگ کی کار پر نظر پڑتے ہی میرے وجود میں ایک جھٹکا سا لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کار بڑی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کار کو رشید خود ہی چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ سیٹ پر اس کے دونوں بچے وردیوں میں ملبوس تھے۔ معمول کی طرح رشید انھیں کانوینٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔ اور میں......، اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے آپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے اندر حسد تلاطم پیدا کررہا تھا۔

میں نے اس حسد کو اپنے سینے میں آرام سے بیٹھنے کو کہا اور خود میں......، یکا یک مجھے اس شخص کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوگئی جس کے پاس خودکشی کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔

دراصل مجھے اس شخص کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ میں اس کا پیٹ چاک کر کے اس کے اندر دل اور جگر نکالنا چاہتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو میں اس کا سر پھوڑ کر اس کا بھیجا بھی نکال دوں گا، میں اپنا بھی دل و جگر نکالوں گا اور اس شخص کے دِل و جگر کے ساتھ اس کا موازنہ کروں گا جس شخص کے پاس خودکشی کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔ جو کسی بھی وقت اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے اس ارادے پر عملی جامہ پہنا سکتا ہے!

جب سے میں نے ہوش سنبھالا، میں نے کتنی بار خودکشی کرنے کا ارادہ کیا مگر میری بزدلی میرے اس ارادے میں اکثر رکاوٹ بن جاتی تھی۔ ہر بار خودکشی کے ارادے کو ٹال کر میں سوچنے لگتا، وہ کون لوگ ہیں جو اس ارادے پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا دِل و جگر کتنا سخت ہے جو اپنے آپ کو دریا میں ڈبو دیتے ہیں۔ پہاڑ کی اونچائی پر سے چھلانگ لگا دیتے ہیں، ریل کی پٹری پر سو کر اپنے آپ کو کٹوا دیتے ہیں، زہر کھا لیتے ہیں یا اپنے آپ کو گولی سے اڑا دیتے ہے، اور اس زندگی کا خاتمہ کرتے ہیں جو زندگی......، زندگی تو میرے لئے بھی ایک وبال ہے کیوں نہیں پہنچا سکتا، مجھے اس جہنم میں جینے کے لئے کون مجبور کر رہا ہے، وہ کون سی شکتی ہے جو مجھے مرنے نہیں دیتی؟

بلو آرڈ روڈ کے راشن گھاٹ پر راشن لانے کے لئے جب میں گھر سے نکلا تو راستے بھر چلتے ہوئے میں نے کتنی بار اس جیب پر ہاتھ پھیر دیا جس میں ادھار کے روپے رکھے ہوئے تھے۔ راشن کے لئے مجھے اکثر روپے قرض پر لانے پڑتے تھے۔ قلیل تنخواہ کی وجہ سے گھر کا گزارہ......، قرض کے بڑھتے بوجھ نے مجھے لاغر کر دیا۔ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے اور قرض سے چھٹکارا پانے کی فکر سے میرا ذہن اکثر پریشان رہنے لگا۔ غم، پریشانی اور مصیبت میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اور ان ہی فکروں میں گھل کر میں راشن لانے جا رہا تھا کہ میرے سامنے رشید کی آسمانی رنگ کی کار گزر گئی۔

رشید میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دسویں جماعت تک ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے دسویں میں مسلسل تین سال تک فیل ہو جانے کے بعد اس نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ میں پہلے ہی سال سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ ایف، اے کرنے کے بعد میں کلرک بن گیا اور رشید......، رشید کو لکھنے پڑھنے کے ساتھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول میں اکثر غائب رہتا تھا۔ اس کے کپڑے اکثر میلے کچیلے ہوتے تھے۔ غریب والدین کا بیٹا اکثر کتابوں، کاپیوں کے لئے ترستا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ کو اس کے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر رشید ان کے ارمانوں کے ساتھ کھیل کر در بدر پھرا کرتا تھا۔ اسکول میں اس کے دل نہ لگنے کی ایک وجہ اس کی غربت بھی تھی۔ غربت کی وجہ سے رشید اکثر کلاس میں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکوں کی ہنسی مزاق کا نشانہ بنتا تھا۔ مجھے یاد ہیں، کلاس میں ایک لڑکا میں تھا جو اس کا حوصلہ بڑھاتا تھا۔ ہر وار کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔ نہ صرف کلاس میں اسے میں اپنے پاس بٹھاتا تھا بلکہ اس کے لئے قلم کاغذ وغیرہ فراہم کرتا تھا۔ پانچویں سے لے کر دسویں جماعت تک میں نے اسے اپنی کئی کتابیں پڑھنے کو دی تھیں۔

رشید کے ساتھ اگر مجھے ہمدردی تھی تو محض اس وجہ سے کہ وہ غریب اور مفلس ماں باپ کا بیٹا تھا۔ حالانکہ رشید جیسا احسان فراموش، میں نے آج تک کوئی نہیں دیکھا۔ اس کی سیمابی طبیعت تخریبی ذہنیت دیکھ کر میں اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد اس کی احساس کمتری دیکھ کر مجھے اپنی حرکت پر خود ہی ندامت ہونے لگتی تھی۔

میٹرک میں مسلسل فیل ہو جانے کے بعد، جب اس نے پڑھائی چھوڑ دی تو اسے گگری بل روڑ پر ایک فرم میں معمولی نوکری مل گئی۔ جو اس نے غنیمت جان کر قبول کر لی۔ اس

نوکری کے دوران اسے کشمیر سے باہر جانے کا موقعہ ملا......، رشید مالک کا مال لے کر باہر جاتا تھا اور وہاں سے روپے لے کر واپس آتا تھا۔ اس آو جاؤ نے اسے ایک تجربہ کار مرد بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا علیحدہ بزنس شروع کیا۔ دس بارہ سال کے اس بزنس میں نہ صرف اس نے اپنے لئے ایک نئی کوٹھی بنوائی بلکہ قیمتی کار بھی خرید لی۔ آج دوبار اسی کار میں میرے سامنے سے گزرا۔ اور میرے لئے حسد، رشک اور نہ جانے کیا کیا چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ رشید اور اس کی کار کا بڑی سڑک پر کوئی نشان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، گویا یہ کار میرے ارمانوں کا دُھواں اڑا کر ابھی ابھی لوٹ کر آئے گی......میں اس سڑک پر کھڑے کھڑے اپنے اور رشید کے ماضی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا......نہ جانے کیا؟

مجھے لحہ بہ لحہ اپنے وجود سے نفرت ہو رہی تھی، جو وجود، سوائے قرض کے زندگی میں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا۔ یکا یک میرا ایمان متزلزل سا ہونے لگا۔ کاش! میں نے بھی چرس کا کاروبار کیا ہوتا۔ کاش! میں نے بھی......مگر اب کیا ہو سکتا ہے! سوائے خودکشی کے۔ اب اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے اندر کے حسد اور رشک نے میرے اس ارادے کو پختہ کرنے کا کام کیا۔ اب کی بار میں مصمم ارادہ کر کے آگے بڑھا اور ایک جست لگا کر کنارے تک آ گیا۔ میں نے ایک بھر پور نظر سے جھیل کو دیکھا۔ جس میں ہاؤس بوٹ قطار سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ان ہاؤس بوٹوں میں سیاح بیٹھے میرے اس کشمیر کی خوبصورتی کا لطف اٹھا رہے تھے جس کشمیر کا ایک ایک انگ مجھے بدصورت اور گھناؤنا لگ رہا تھا۔ جھیل میں ٹیکسی شکارے تھرک رہے تھے اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگ اس جھیل کا نظارہ دیکھ رہے تھے، جس جھیل میں ڈوبنے کے لئے میں اپنے آپ کو بالکل تیار کر کے بیٹھا تھا۔ میں مکمل ارادہ کر کے وہ جگہ ڈھونڈ نکال رہا تھا جہاں پر میں چھلانگ لگا کر اس زندگی کا خاتمہ کروں جس زندگی نے مجھے پل بھر کے لئے بھی سکون نہیں دیا۔

خودکشی کرنے سے پہلے، سب سے پہلے میں سوچنے لگا۔ اگر اس وقت کوئی بھکاری یہاں سے گزرتا تو میں راشن کے یہ سارے روپے اس کے حوالے کر دیتا، ورنہ پانی میں یہ روپے اسی طرح ضائع ہو جائیں گے جس طرح میرا وجود ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ میرا

وجود تو بالکل ناکارہ ہے۔ اس کے مقابلے میرے پاس جو یہ روپے ہیں، بہت قیمتی ہیں! خودکشی کے لئے بالکل تیار ہو کر میں نے آنکھیں بند کر لیں کہ یکا یک مجھے خیال آیا...... میری بیوی بچے کیا کریں گے......؟

بیوی بچوں کی یاد آتے ہی میرے وجود میں زلزلہ سا آ گیا۔ اور میں...... میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ دل ڈوبنے لگا اور آنکھیں ...... میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا یہ پختہ ارادہ متزلزل سا ہو گیا۔

مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کی حالت کا ایک دُھندلا سا عکس میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے لگا اور میں نے اپنے آپ کے قاتل کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کی حالت کا ذمہ دار بن کر اپنی ہی نظروں میں قابل نفرت اور ملامت بننے لگا۔

میرے بغیر میری بیوی اور بچوں کی مجبوریاں میرے اس ارادے میں ضرور رکاوٹ بننے لگیں، میں تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگا۔

''میری بیوی'' جس نے کبھی بھی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ بھوکی ہے، میرے بعد بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر نہ جائے۔ میرے بچے میرے بعد بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ لہذا مجھے اس حالت پر ہی قناعت کرنا چاہیئے۔ مجھے خدا پر بھروسہ کر کے آگے بڑھنا چاہیئے۔ مجھے زیادہ محنت کرنی چاہیئے۔ کبھی نہ کبھی ہمارے یہ بُرے دن دور ہو جائیں گے۔ گھٹا ہمیشہ نہیں رہتی، مجھے عزم، ہمت اور حوصلہ سے آگے بڑھ کر غربت اور ناداری کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔ خودکشی بزدلی ہے۔ مجھے ایسی بزدلی کا خیال بھی ذہن میں نہیں لینا چاہیئے۔!''

اتنا کچھ سوچ کر میں واپس مڑ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ میرے چلنے کا انداز اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اب میں غربت اور مفلسی کو بھگاتے ہی دم لوں گا۔ میں ایک نئے ولولے، نئے عزم اور ہمت کے ساتھ خوش حال مستقبل کی طرف اس انداز سے بڑھ رہا تھا کہ زمین پر میرے پاؤں پڑتے ہی نہیں تھے۔ میں اس وقت خوشی اور مسرت سے اس طرح سڑک پار کر رہا تھا، گویا میں نے کوئی عظیم معرکہ سر کر لیا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بڑی تیزی سے سڑک پار کر رہا تھا کہ یکا یک میں ...... میں آسمانی رنگ کی ایک تیز رفتار کار کے نیچے آ کر کچل کر دم توڑنے لگا۔

☆☆☆

عمر مجید

میری گلی کا غم

محلے کی بڑی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو چکی ہے لیکن جس گلی میں میرا گھر ہے وہ سونی پڑی ہے۔ میلی میلی سی صبح...... خزاں کی صبحیں ایسی ہی ہوتی ہیں شاید۔ خاموش خُنک، کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے...... بس لحاف کے اندر...... دُبک کر، چھت کی کڑیوں کو گننا اچھا لگتا ہے۔

لوگ ابھی سو رہے ہیں جیسے انہیں چولہا نہ جلانا ہو۔ ناشتہ نہ کرنا ہو، کام کاج کے لئے نہ نکلنا ہو۔ امام صاحب نے نماز عشاء پر اعلان کیا تھا کہ کل محلے کی بڑی گلی میں دکانیں بند رہیں گی۔ ''یعقوب'' کی موت کے غم میں، جسے کل سہ پہر بڑی گلی کی نکڑ پر سیکورٹی فورسز نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

امام صاحب نے صرف دُکانیں احتجاج کے طور پر بند کرنے کے لئے کہا تھا لیکن لوگوں نے عام ہڑتال سمجھ کر دُکانوں سمیت دیگر کاروبار بھی بند کرنا سمجھ لیا ہے۔

سب لوگ سو رہے ہیں، صرف میں آئینے کے سامنے شیو بنا رہا ہوں۔ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ آج میرا اسلیکشن ہونے والا ہے، مجھے آج اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا تا کہ میں راجدھانی میں منعقد ہونے والے کرکٹ کے تربیتی کیمپ میں شامل ہونے کے لئے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دوں۔ کیمپ میں بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو ملک کی قومی کرکٹ ٹیم میں شامل کئے جانے کے روشن امکانات ہیں۔ اسلئے آج کا دن میرے لئے نہایت اہم ہے۔ میرے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے آج مجھے ہر دم تازہ دم نظر آنا چاہئے۔ چست چالاک اسی لئے میں اہتمام کے ساتھ شیو بنا رہا ہوں ورنہ میں اس قدر پابندی اور صفائی کے ساتھ شیو نہیں بنایا کرتا۔

میں نوجوان ہوں لیکن مجھے اپنے اندر کسی بھی قسم کا اُبلتا ہوا لاوا نظر نہیں آتا، نہ آگ، نہ

تپش، نہ تمازت، نہ حرارت، صرف راکھ کا ایک ڈھیر، جس میں نہ شعلہ ہے نہ چنگاری، میں جانتا ہوں کہ بچپن بذاتِ خود معصومیت ہے، جوانی بذاتِ خود ایک حسن اور بڑھاپا بذات خود ایک دائمی بیماری ہے۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے لیکن میں جب شام کو تھکا ماندہ گھر لوٹتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی ریٹائرڈ سکول ماسٹر ہوں۔ تھکے تھکے سے قدم، بوجھل سانسیں، غمزدہ مسکراہٹ، میں بھول جاتا ہوں کہ میں بی اے فسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔ ایک عمدہ گیند باز، تیز رفتار، ایکوریٹ، نپی تلی گیند پھینکنے والا۔ میرے دوستوں اور افراد خانہ کا پختہ خیال ہے کہ اگر مجھے صحیح تربیت ملے تو میں ملک کا ایک مایہ ناز گیند باز بن سکتا ہوں۔

''یعقوب'' ...... مجھے یعقوب بار بار یاد آ رہا ہے۔ غوث چاچا کا پوتا، اخروٹ کی لکڑی کی رنگت لئے ہوئے بال، لمبے اُلجھے ہوئے، نیلے رنگ کی آنکھیں ادھر ہمارے ہاں بہت کم لوگوں کی آنکھیں اتنی گہری تیز، اتنی خوابیدہ اور اتنی روشن ہوتی ہیں، اُس کے باپ محمد افضل کی آنکھیں سیاہ رنگ کی تھیں لیکن میں نے اپنی ماں کو کہتے سنا ہے کہ اُس کی دادی کی آنکھیں گہرے سبز رنگ کی تھیں۔

سکول سے گھر لوٹ رہا تھا، گلی میں داخل ہوا تو ایک مشروب کے خالی ڈبے سے پاؤں ٹکرایا...... پہلی ٹھوکر مزے دار نہ تھی...... دوسری ٹھوکر مارنے کے لئے جی نے اُکسایا۔ خالی ڈبہ اڑ کر قریب کے بنکر کے باہر ایک پہرے دار کے سینے سے ٹکرایا...... پہرے دار بدحواس ہوا۔ اُس نے بندوق کا گھوڑا دبایا......اور یعقوب!!

دراصل بہادر نظر آنے والا ہر شخص ازلی بزدل ہوتا ہے۔ اسے دو چیزوں کا ڈر لگا رہتا ہے، کوئی اُس سے اُس کی طاقت چھین نہ لے، اور اُس کا دشمن اُس پر غالب نہ آئے۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اپنے مدمقابل پر اپنی بھرپور طاقت سے وار کرتا ہے۔ سپاہی نے مشروب کا خالی ڈبہ ہوا میں اپنی طرف تیرتے ہوئے آتے دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ اُس پر کوئی خطرناک چیز پھینکی ہے۔ اُس نے جوابی کاروائی کی اور یعقوب کے سینے کے سُرخ باغ میں ایک گہرا سوراخ پیدا ہوا اور اُس میں سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

سات بج رہے ہیں۔ گلی اب بھی سناٹے کی چادر میں لپٹی ہوئی خاموشی کے نغمہ سنا رہی ہے۔ ماں نمکین چائے کا پیالہ اور ایک نان میرے سامنے رکھتی ہے۔ ''جانا ضروری ہے''۔

''ہاں ماں آج سلیکشن ہے''۔ ماں ایک گہری سانس لے کر رہ جاتی ہے۔ میں روٹی کو

چائے میں بھگو کر نوالہ توڑتا ہوں۔ نام بھی ہوگا، کام بھی ملے گا۔ اچھی کارکردگی دکھانے پر نوجوان کھلاڑیوں پر اشتہاروں کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ ایک ایک ایڈ فلم میں کام کرنے پر لاکھوں روپے مل جاتے ہیں اور اپنے ملک میں تیز گیند بازوں کا ہمیشہ کال رہتا ہے۔ کیا معلوم قسمت چمکے۔ سب غم دور ہوں گے، گلی کی طرف کھلنے والے کھڑکی کھولتا ہوں۔ غوث چاچا کے گھر میں تعزیت کرنیوالے ایک ایک کر کے داخل ہو رہے ہیں۔ سفید وردی پالی تھین کے لفافے میں ڈال کر باہر آتا ہوں۔ گلی میں ماتم ہے۔

چور نظروں سے غوث چاچا کے مکان کو دیکھتا ہوں۔ مکان منہ بسورے نظر آرہا ہے۔ یہ شاید میرا واہمہ ہے، سب مکان جن پر رنگ و روغن کی چادر نہ چڑھائی گئی ہو ایسے ہی منہ بسورے کھڑے نظر آتے ہیں۔ انسان کی موت کا مکان کی بناوٹ سے کیا کام؟ گلی کی ہر شئے اُداس اُداس نظر آتی ہے۔ دو فرلانگ لمبی گلی، ایک ایک قدم اُٹھانا بھاری ہو جاتا ہے۔ ماتم بس گلی کے نکڑ تک ہے نکڑ کے اُس پار زندگی رواں دواں ہے۔ وہاں کوئی ماتم نہیں، پہلے کوئی اس طرح مارا جاتا تھا تو شہر کی ہر گلی میں ماتم منایا جاتا تھا۔

بہت دنوں تک ماتم کرتے کرتے ہم تھک گئے تو اب ماتم صرف اپنے محلے کی خاص گلی تک محدود ہو کے رہ جاتا ہے۔ تاریخ اسی طرح بدل جاتی ہے اور زندگی اسی طرح دوڑتی بھاگتی ہے۔ موسم اسی طرح بدلتے ہیں۔

غوث چاچا، بڑے ملنسار شخص ہیں، ہر کسی کے دُکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، پُرسہ، ماتم، آنسو ہمیشہ پیش پیش۔ تمباکو بہت اُڑاتے ہیں۔ اپنی تمباکو کی پڑیا ہمیشہ ''پشاور تمباکو سٹور'' سے خریدتے ہیں جو گلی سے باہر آتے ہی مین روڈ پر واقعہ ہے۔ مامہ کلو تمباکو فروش سے اُس کی گاڑی چھنتی ہے۔ دونوں دوست راز و نیاز کی باتوں میں گھنٹوں بتاتے ہیں۔ ایک دن میں چٹکی پان مصالحہ خریدتے مامہ کلو کی دُکان پر پہنچا تو غوث چاچا مامہ کلو سے کہہ رہے تھے۔

جانتے ہو مامہ دُنیا کی سب سے سخت چیز کیا ہے؟ نہیں جانتے! میں بتاتا ہوں، لوہا اور لوہے سے سخت؟...... نہیں معلوم...... میں بتاتا ہوں۔ لوہے سے بھی سخت چیز آگ ہے جو لوہے کو پگھلا دیتی ہے اور آگ سے بھی سخت چیز پانی ہے جو آگ کو بجھاتی ہے اور پانی سے بھی زیادہ سخت چیز ہوا ہے۔ جو پانی کو دھکیلتی ہے۔ ہوا سے بھی سخت چیز سمندر ہے جس سے

بھاپ اُٹھتی ہے۔ سوئے آسمان جاتی ہے اور بارش برساتی ہے۔ سمندر سے بھی سخت سورج ہے جس کی تمازت سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اُڑتا ہے لیکن ان سب چیزوں سے سخت غم ہے، جو انسان کے دل کو کاٹتا ہے۔ آج دو پڑیاں دو، آج نذیر اور اُس کی ماں دونوں خواب میں دیکھے تھے۔

نذیر اُس کے بیٹے کا نام تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ میں ملازم تھا۔ ٹرک چلاتا تھا، لوہا لے کر لداخ جا رہا تھا، برفانی تودے نے گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر لداخ کا راستہ بھاری برف کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اگلے برس برف نے پگھلنا شروع کیا تو نذیر اپنے ٹرک سمیت ایک کھائی میں پڑا ہوا نظر آیا۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے محلے کی بڑی گلی سے گزرتا ہوں لیکن ہر قدم پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گلی کا غم مقناطیس بن کر میرے پاؤں کو زمین کی طرح کھینچ رہا ہے۔ سامنے سے ایک جلوس آرہا ہے، ایک خاتون لیڈر شاید غوث چاچا کو پُرسہ دینے کے لئے گلی میں داخل ہو رہی ہے۔ سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ کے ساتھ ہے۔

"بنکر ہٹاؤ......نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

یہ بنکر بہت برس پہلے گلی کے نکڑ پر بنوایا گیا تھا۔

خاتون لیڈر کے بعد غوث چاچا کو پُرسہ دینے کے بعد شاید سرکاری نمائندہ آ گیا۔

"سرکار آپ کے غم میں برابر کی شریک ہے، سرکار کی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس دلدوز واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات ہوگی اور ملزم کو پوری کی پوری سزا ملے گی"۔

سرکاری ترجمان کے بعد کوئی اور لیڈر آئے جب تک ہمارا فیصلہ نہیں ہوگا تب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ بے گناہ مارے جاتے رہیں گے۔

"میری گلی کا غم کیا ہے؟"

میں سوچتا ہوں، روٹی، روزی، بجلی، پانی، کوئلہ، یا کچھ اور......!!

قدم وزنی ہوتے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھنے کی تمام قوت زائل ہوتی جا رہی ہے۔ دل پچھلے پہر کے چاند کی طرح بجھ جاتا ہے۔ میں گلی عبور کر چکا ہوں۔ مین روڈ پر نکل آیا ہوں، یہاں سے یونیورسٹی کیمپس کے لئے مجھے بس پکڑنی ہے۔

سڑک پر زندگی رواں دواں ہے۔ میں مامہ کلو کی دُکان کی طرف قدم بڑھاتا ہوں، نہ

چاہتے ہوئے بھی میں مامہ کلو سے کہتا ہوں:

''دو پڑیاں، تمبا کو، بھاری ہلکا ملا کے......!!''

''آج پان مصالحہ نہیں!''

''نہیں......!!''

میں واپس مڑتا ہوں، گلی پہلے کی طرح غمزدہ ہے، میں تھکے تھکے سے قدم غوث چاچا کے گھر کی دہلیز کی طرف بڑھاتا ہوں۔ اکثر منزلیں اسی طرح، اچانک بدل جاتی ہیں اور راستے ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

وریندر پٹواری

گرہن

وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ رات بھر جاگ جاگ کر، ایڈیٹنگ مشین کے سامنے بیٹھ کر، بار بار اپنی ٹیپ کو آگے پیچھے کرتے ہوئے ہر بار اپنے بنائے ہوئے ٹیلی فیچر کو دیکھ دیکھ کر سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس کی تخلیق میں آخر کس چیز کی کمی ہے یا کون سی خامی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی بات کہہ نہیں پایا ہے۔ کیا واقعی اس کے پہلے ٹیلی فیچر میں جواز کا فقدان ہے؟ وہ جو بات اب سمجھ چکا ہے کاش وہ راز وہ پہلے جان پاتا۔ کل تک جو لوگ اس کو میڈیا کا سورج کہا کرتے تھے وہ آج اس کو مصور وین گاگ یا ٹالسٹائی کی طرح جنونی تجربہ کرنے والا احمق دانشور کہہ کر اس کے حوصلے کو توڑنے کی خاطر ایک ہی پلیٹ فارم سے بول رہے تھے کہ اشتہاری فلمیں بنانے والے سورج پر گرہن لگ گیا ہے جبھی تو وین گاگ کی طرح اپنا کان کاٹ کر اپنی محبوبہ کو بھیج رہا ہے اور پھر ٹالسٹائی کی طرح کھڑکی سے کود کر یہ جان لینا چاہتا ہے کہ کیا انسان بھی پر لگا کر پرندوں کی طرح اُڑ سکتے ہیں۔ ایسے تنقیدی جملے اس کو بار بار ڈراؤنے بادلوں کی گرج کی گونج بن کر اپنے ذہنی کرب کا احساس دلا رہے تھے اور ہر بار وہ اپنے فیچر کو رِوینڈ (REWIND) کر کے دیکھتے ہوئے اپنے دل سے اٹھی ہوک کو شدت سے محسوس کرنے لگا۔

جب وہ صابن، ٹوتھ پیسٹ، کولڈ ڈرنک وغیرہ پر اشتہاری فلمیں بنایا کرتا تھا تب ناظرین کم اور ناقدین زیادہ اس کے منفرد اسلوب پر قصیدے پڑھا کرتے تھے، جب وہ بذاتِ خود اپنے فیچر کو دیے گئے اسلوب پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ ناقدین نے اس کی تخلیق کو بے موت مار کر مرثیہ پڑھنا شروع کیا تھا تا کہ لاش کو دفن کیا جا سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے کردار زندہ ہیں۔ یہی سوچ کر اس نے ہر کردار پر توجہ دے کر بطور راوی ایک سوال پوچھا تھا۔ ''اگر آپ کو میں ایک کروڑ روپے دے دوں تو، آپ کیا کریں گے؟'' کردار کی عکاسی، ماحول کی عکاسی، کردار کے جذبات، احساسات اور خیالات ان کے چہرے کے تاثرات م

آنکھوں کے عمیق گہرائیوں سے ظاہر کر کے اس نے ہر کردار کا مونتاژ بنا کر اس نے کئی کرداروں کو کولاج بنا ڈالا تھا۔ اور اس کے فیچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر کردار کے جوابات سن کر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سوال کیا پوچھا گیا تھا۔

فیچر کا آغاز ایک سڑک چھاپ، میلی کچیلی مگر خوب صورت جوان طوائف کے جوابات سے ہوا تھا اور وہ پہلا سوال سن کر یوں ہنس پڑی ہے گویا کسی نے اس کو رُلانے کے لئے ہنسایا ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک ایک پھلجھڑی کی طرح نظر آ رہی تھی بلکہ یوں دکھائی دے رہی تھی گویا تیل کی چند بوندوں کی محتاج چراغ کی باقی تیل چوس کر بجھتے بجھتے پھر جل اٹھی تھی، طوائف نے آہ بھر کہا تھا: ''بابو کروڑ کی بات کیوں کر رہے ہو۔ تیس پچاس روپے لے کر، کسی فٹ پاتھ پر رہنے والے یا کسی آٹو چلانے والے کے ساتھ چلی جاتی ہوں، آپ کو میرے کپڑوں یا منہ سے باس آتی ہے تو کپڑے بدل کر آؤں گی۔ شادی کا جوڑا پہن کر، پان تھوک کر لپ اسٹک لگا کر آؤں گی، بال دھو کر، جوئیں نکال کر اور کاجل لگا کر، چہرے پر کریم لگا کر آؤں گی۔ پھر گھر لے چلو یا ہوٹل میں، رات بھر ساتھ رہوں گی۔ لیکن تب جب تین سو روپے پیشگی اور کل پانچ سو روپے دو گے۔ پیشگی اس لئے کہ آج سامان خرید لوں گی نا؟ زیور نہیں بابو۔ جوئیں مارنے والی دوائی، خوشبودار صابن، کریم، پاوڈر......؟ آپ پھر کروڑ کی بات کر رہے ہو۔ تو سنو۔ میں کروڑ روپے لے کے دس سال کے لئے راشن خرید لوں گی؟ دس سال اس لئے کہ تب تک بیٹا بیس سال کا ہوگا اور وہ مزدوری کر کے کھلا دے گا۔ رہی بات بیٹی کی تو اس کی شادی ہو جائے گی۔ پھر روپے بچ گئے تو ایک گھر بنا لوں گی۔ ویسا ہی جیسا ہمارے گاؤں میں تھا اس گھر میں میرے شوہر کو نہ کبھی کھانسی آتی تھی اور نہ کبھی بخار آتا تھا۔ خود دھان کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ گاؤں چھوڑ کر شہر اس لیے آئے کیوں کہ سیلاب فصل کھا گئی۔ اور روپے بچ گئے تو بچوں کو اسکول بھیج کر خود وہی شادی کا جوڑا جو ساتھ لائی ہوں گاؤں سے پہن کر دن رات اپنے شوہر کی سیوا کروں گی۔ بابو گھر میں راشن ہو تو میں یہ کام کیوں کروں؟ یہ اتنے سارے سو سو کے دس نوٹ؟ کیوں؟ اتنے روپے۔ میرا معاوضہ؟ کس کام کے لئے؟ پھنسا تو نہیں رہے ہو۔؟؟

طوائف کے بعد ایک نوجوان کے جوابات تھے۔ ''ایک کروڑ؟ نہ کم نہ زیادہ؟ پچیس لاکھ روپے ڈونیشن دے کر M.B.B.S کی سیٹ۔ پچیس لاکھ M.D کی سیٹ کے لئے اور باقی بچے پچاس لاکھ میں ٹریننگ کے دوران آئے خرچے کو کاٹ عالی شان کلینک۔ ایسا

میں چھ مہینے پہلے کہتا۔تب میں بہت اچھے نمبر لا کر ایک ڈاکٹر بن جانا چاہتا تھا۔وہ بھی موت سے لڑ کر زندگی کو بچانے کی خاطر۔مگر اب میں زندگی کو موت کے حوالے کر دینے کا کام کرتا ہوں۔اس لیے میں جدید ترین مہلک ہتھیار خرید کر ایک طاقت ور کی طرح کمزوروں پر حکومت کروں گا۔ایک کروڑ سے دس کروڑ بنا لوں گا۔دس سے بیس، بیس سے چالیس۔یہ کیا مسٹر؟ کروڑ کی بات کر کے ہزار روپے معاوضہ؟ ہزار روپے کے لیے میرا قیمتی وقت ضائع کر دیا'' اگر وہ نوجوان کی آنکھوں میں دہک رہے انگارے دیکھ کر اپنے ریکارڈنگ ٹیم کے ساتھ بھاگ نہ گیا ہوتا تو انوکھے ٹی وی فیچر بننے والا خود ایک المناک خبر بن گیا ہوتا۔ حالانکہ شوٹ (SHOOT) کیے گئے ایسے واقعات کو اس نے دانستہ طور پر اپنے فیچر میں نہیں رکھا گیا تھا مگر اپنے فیچر کے ہر سیگمنٹ (SEGMENT) کے ساتھ جڑی یادیں جہاں اس کے احساسات کا تعاقب کر کے ڈرا رہی تھی وہاں اس کے خیالات کو ایک نئی ترتیب دے کر یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی کہ کہیں انہونی کو نکال دینے کی وجہ سے اس کے معنی خیز فیچر میں جواز کا فقدان تو نہیں ہے۔چند لمحات کے ذہنی تناؤ کے بعد وہ پھر اپنے فیچر کے اگلے حصے کو دیکھتا رہا تھا۔نوجوان کے بعد اس کے فیچر میں ادھیڑ عمر کے ایک پُراسرار بوڑھے کا انٹرویو تھا جو اس کو عدالت کے احاطے میں لوگوں کے ہجوم میں ایک مغرور شخص نظر آیا تھا کیوں کہ اس کے لیے حالت ایسی تھی گویا ایک گھنے جنگل میں ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی شاخوں سے شائیں شائیں کی آوازیں پیدا کرنے والے درختوں میں کھڑا ایک خاموش درخت۔اس نے اس سے بھی وہی سوال پوچھا تھا بزرگ میاں! اگر آپ کو ایک کروڑ روپے مل جائے تو آپ کیا کرو گے؟ وہ معنی خیز نگاہوں سے اس کو دیکھ کر بہت ہی نیچے سر میں بول پڑا تھا:

''پیش۔آہستہ بولو، ڈاکو سن لیں گے۔لوٹ کر اگر زندہ بھی چھوڑ دیں گے تو مجھ سے دوسرا مقدمہ لڑنے کی ہمت نہیں۔پہلے مقدمے کا فیصلہ آج ہو جائے گا، ایسا وکیل نے کہا ہے۔ سنو ایک کروڑ نہیں، دس کروڑ مل جائیں گے۔خبر اڑ کر آئے گی۔تم ایک کروڑ کی بات کیوں کر رہے ہو؟

دیکھو نہیں غور سے سنو۔یہ جو نیل ہوتی ہے نا، نیل۔وہی جس سے کپڑے اجلے ہوتے ہیں۔اتنا بھی نہیں معلوم؟ نہیں کی کھیتی جس زمین میں ہوتی ہے وہ سال کے لیے بنجر ہو جاتی ہے۔مگر اگلی فصل پورے چار سال کے فائدے دے جاتی ہے زمینداروں کو۔میری زمین میں ایک سال میں دو دو فصلیں پیدا ہو جاتی تھی اب حساب لگا لو۔56 سال میں کتنی

فصلیں ہوتیں؟اوران کی قیمت؟ایک کروڑ؟نہیں نہیں دس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔لگی شرط؟ ملک کا بٹوارہ ہوااور میری زمین آزادی کھاگئی۔ میں یہاں اور میری زمیں میرے آبائی گھر کے اردگرد۔ افسر کہہ رہے ہیں کہ زمین اور گھر کو سیلاب نگل گیا۔ میں ثابت کرلوں گا کہ میری زمین کہاں تھی لیکن ایک بار مجھے سرحد پار کرنے تو دیں؟ہاں میرا ایک چشم دید گواہ ہے اور وہی میرا وکیل بھی ہے بلکہ حصے دار بھی ہے۔سنا ہے آج کل جو یہاں جج ہے وہ بھگوان سے ڈرتا ہے۔ مطلب یہ کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا کیوں کہ میرا گواہ، میرا وکیل اور حصے دار بھگوان ہی تو ہے''۔ وہ ایک پاگل تھا۔ یہ اس نے اپنے فیچر میں واضح طور پر بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا شاید یہ بھی جواز کے فقدان کی وجہ ہے؟ وہ آہ بھر کر فیچر کا اگلا حصہ دیکھتا رہا۔ سوال وہی تھا مگر جواب چونکا دینے والا تھا''ایک کروڑ وہائٹ (WHITE) میں ملے گا تو بدلے میں، میں آپ کو دو کروڑ بلیک (BLACK) میں دوں گا۔ میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔کاروباری آدمی ہوں۔ایک کروڑ وہائٹ سے میں بیس کروڑ کی انویسمنٹ کر کے پرانا دھندہ بند کر کے کوئی عزت والا دھندہ کرلوں گا۔ بچے بڑے ہو گئے ہیں اس لیے اب تمام عیش گاہیں بند کر کے ایک ہوٹل بنا کر آرام سے زندگی بسر کرلوں گا۔اس نے جب ایک سبک دوش ایماندار افسر اعلیٰ سے یہی سوال پوچھا تھا تو اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جو جواب دیا تھا وہ اس کے فیچر کا اگلا حصہ یعنی سیگمینٹ (SEGMENT) تھا۔

''اپنے دونوں بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کو بیس بیس لاکھ دوں گا۔ پھر ان سے ایک ایک لاکھ مانگ کر اپنے گھر کی مرمت کروں گا اور جو رقم بچ جائے گی اس سے اپنی بیوی کی دیرینہ خواہش پوری کروں گا۔یعنی اس کو تیرتھ یاترا پر لے جاؤں گا۔کن روپیوں کی بات کررہے ہیں آپ؟ایک کروڑ میں چالیس لاکھ تو انکم ٹیکس میں چلا جائے گا نا؟؟ سینئے آپ اگر لوگوں کی دبی خواہشات کو کرید کر نکالنا چاہتے ہیں تو سمجھ لو کہ آپ کو کامیابی مل گئی ورنہ کیا میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ مجھ جیسے افسر کو اگر نوکری کے دوران کسی نے ایک روپیہ دینے کی جرأت نہیں کی تھی تو اب کوئی کیوں دے۔قابلیت کا اتنا بھاؤ نہیں ہے ابھی اس ملک میں۔'' وہ واحد شخص تھا جس نے اصرار کر کے پورے یونٹ کو چائے پلائی تھی اور کہا تھا ایک ایماندار افسر اپنے ہم عہدے داروں کے مقابلے میں کسمپرسی کی زندگی گزارتا ہے۔یعنی اس کے بچے عیش نہیں کرسکتے ،کلبوں میں اپنا زیادہ تر وقت گزار نہیں سکتے ہیں، ہوائی سفر طے

نہیں کر سکتے، اپنے تعلقات صنعت کاروں یا امیر ترین لوگوں کے عیاش بچوں کے ساتھ نہیں رکھ سکتے مگر مہمانوں کو چائے پلا سکتے ہیں اور وہ بھی فیچر میں جواز کا فقدان نہ ہوتا۔ دل شکستہ ہو کر اس نے اگلا سیگمینٹ (SEGMENT) دیکھا جس میں اس نے ایک پُر جوش لیڈر سے وہی سوال پوچھا تو اس نے فوراً جواب دیا تھا۔ ''پوری کی پوری رقم آپ کو دوں گا۔ اور بدلے میں حریفوں کی، حلیفوں کی یا دشمنوں کی کوئی ایسی ریکارڈنگ لوں گا جس سے ملک کا سیاسی توازن بکھر جائے اور عوام کو میں ہی، فقط میں ہی ایک مسیحا نظر آجاؤں۔ اگر سودا منظور ہو تو سودا طے کرلیں۔ یعنی ایک ڈیل''۔ وہ بار بار اپنی تیار کردہ کیسٹ دیکھتے دیکھتے اس خاص حصے کو دیکھ کر اس کے آگے موجود دلچسپ حصوں کو دیکھنے کے بجائے تذبذب اور تجسس کے اثر میں ایک کلاک کے پینڈولم کی طرح لٹکتا رہتا ہے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔

آخر ایک الارم جیسی آواز نے گویا اس کو نیند میں چلتے چلتے اچانک بیدار کر دیا اور وہ یوں چلا پڑا گویا ایک معصوم عدالت میں چلا رہا ہو کہ میں بے قصور ہوں اور میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ اس حصے میں کیا کسی جواز کی ضرورت ہے۔؟؟ پھر اس نے یہ طے کیا کہ وہ اپنے فیچر کو...... وطن داروں کو دکھانے کی بجائے کسی انٹرنیشنل پنوراما میں دکھا کر اپنی کہی باتوں کا جواز پیش کر پائے یا نہیں مگر یہ ممکن ہے کہ اپنے ملک کی حالت دنیا کو دکھا کر اس کو اعزاز یا انعام حاصل کر پائے۔

پھر ضمیر جاگ پڑا تو وہ سوچنے لگا کہ کہیں لیڈر ہی نے بدلے حالات میں اپنے انٹرویو کے ٹیلی کاسٹ کو روکنے کی خاطر کروڑوں روپے خرچ کر کے اس فیچر میں رکاوٹ کے لیے جواز نام کا وائرس (VIRUS) تو نہیں ڈالا ہے؟ پھر سوچ نے مشورہ دیا کہ اگر وہ لیڈر کا حصہ نکال کر فیچر کو پھر سے پریویو (PREVIEW) کرانے کی کوشش کرلے تو شاید خوامخواہ کی منفی تنقید سے بچ پائے گا اور یوں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو پائے گا، مگر اس سے پہلے کہ وہ از سرِ نو اپنے فیچر کی ایڈیٹنگ کر پاتا ایک خیال نے ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے پسینے سے شرابور ماتھے سے ٹکرا کر سورج پر گرہن تو نہیں لگا دیا ہے؟ سوچ لو!! پھر اپنی کیسٹ جوں کی توں اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر وہ سحر کا انتظار کرنے لگا۔ یہ سوچ کر کہ کل کے سورج پر گرہن نہیں لگا ہوگا اور اگر لگ بھی گیا ہو تو وہ گرہن کے ٹل جانے کا انتظار کرے گا۔! ☆☆

ظہورالدین

بیگ والا

جب وہ گھر سے روانہ ہونے لگا تو اس کے بوڑھے باپ نے ایک بڑا سا بیگ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

''اس میں تمہاری ضرورت کی سبھی اشیاء موجود ہیں۔تم اگر ان کا درست استعمال کرتے رہے تو بہ آسانی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔''

اس نے بیگ کو کندھے پر ڈالتے ہوئے محسوس کیا وہ خاصا بھاری تھا۔پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔

وہ چلتا رہا..........!

چلتا رہا..........!

پتھریلی اور پر خار راہوں کو ناپتا رہا.......... پہاڑوں ،جنگلوں اور ویرانوں کے سینوں کو چیرتا رہا۔تاریک اور روشن وادیوں میں .... پگڈنڈیوں اور شاہراؤں پر اس کے قدم گونجتے رہے۔

وہ دن بھر بیگ کو اپنے کندھوں پر لادے چلتا رہتا اور جب رات ہو جاتی تو اسے سر کے نیچے تکیے کے طور پر رکھ کر سو جاتا۔ بیگ کے بوجھ نے اس کی کمر دوہری کر دی تھی۔ اس کے شانے شل ہو چکے تھے۔لیکن وہ اسے اٹھائے چلتا رہا...... چلتا رہا...... چلتا رہا...... پربتوں ،چٹیل میدانوں، کہساروں اور دریاؤں کو پھلانگتا ہوا وہ بڑھتا رہا۔ اس نے آبشاروں، بل کھاتی ندیوں اور کلکلاتے چشموں کا پانی پیا۔ سرسبز مرغزاروں میں کلیلیں کرتے ہوئے ہرنوں سے اٹکھیلیاں کیں۔خوش الحان طیور اس کی راہوں میں آواز کا جادو جگاتے رہے اور وہ اپنے چاروں اور پھیلی بھرپور زندگی کے احساس سے سرشار منزل در منزل آگے ہی آگے بڑھتا رہا...... بڑھتا رہا...... اور پھر ایک روز اچانک اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو مادرزاد برہنہ حالت میں سڑک کے بیچ سر کے بل کھڑا تھا۔اس

کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔

''کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔''

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر اپنے خیال کی صحت کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس کی بائیں اور سے ذرا ہٹ کر نکل جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی اثنا اس نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

''باپ تو گدھا تھا ہی بیٹا اس سے بھی سوا نکلا۔''

بیگ والا رُک گیا۔ برہنہ شخص کے الفاظ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ اب اس کے لئے ایک پراسرار شخصیت بن چکا تھا۔ اس نے دفعتاً اس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''کہنا نہیں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے باپ کے دیئے ہوئے اس بوجھ کو کب تک یوں ہی اٹھائے پھرتے رہو گے؟''

وہ اب بھی سر کے بل کھڑا تھا۔ خون کی گردش کی وجہ سے اس کی گردن کی آواز سن کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کسی گہری غار یا تہہ خانے میں بول رہا ہو۔ اس کے جواب نے بیگ والے پر سچ مچ بوکھلاہٹ طاری کردی اور ایک مبہم سا خیال جو اس کے تحت الشعور میں دیر سے کلبلا رہا تھا پھدک کر شعور کے آسمانوں پر پھیلنے لگا......اور پھر چشم زدن میں اس کے شعور کا افق برسات میں گھنگور بادلوں سے اٹے ہوئے آسمان کی طرح گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

''کیا کوئی مافوق الفطرت طاقت مجسم روپ میں میرے سامنے کھڑی ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے ماتھے پر ابھر آئیں۔ برہنہ شخص اس کی نفسیاتی کشمکش بھانپ کر بے اختیار ہنس پڑا۔ سر کے بل کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کا قہقہہ بھی کچھ اس قدر مہیب تھا کہ بیگ والے کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ابھی وہ اپنی نفسیاتی حالت پر قابو بھی نہ پاسکا تھا کہ اس نے سنا وہ پھر اس سے مخاطب تھا۔

''ڈرو نہیں! میں کوئی بھوت پریت نہیں ہوں۔'' برہنہ شخص کی اس یقین دہانی کے باوجود وہ اپنے نفسیاتی کرب سے نجات حاصل نہ کرسکا۔ دل و دماغ میں ہو رہی ہل چل سے مجبور ہو کر وہ بالآخر پوچھ ہی بیٹھا۔''

''اگر تم بھوت ووت نہیں ہو تو پھر تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ بیگ مجھے میرے باپ نے دیا ہے۔'' بیگ والے کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔ اس دوران برہنہ شخص سیدھا کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیگ والے کو گھورتا رہا۔ شاید اس کے سوال کا جواب دینے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔ پھر اس کے قریب آتے ہوئے پرسکون انداز میں کہنے لگا۔ جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

''پھر'' بیگ والا ہکلایا۔

''میں نے اسے پھینک دیا۔'' برہنہ شخص کندھوں کو جھٹکتے ہوئے یوں بولا۔ جیسے سچ مچ کوئی شے کندھوں سے اتار کا پھینک رہا ہو۔

''کیوں'' بیگ والے کو اب پھر برہنہ شخص کی ذہنی صحت مشکوک نظر آنے لگی تھی۔

''وہ بہت بھاری تھا۔''

''تو کیا تمہارے باپ نے تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس میں تمہارا رختِ سفر ہے۔''

''ہاہاہا......ہا'' وہ پھر پاگلوں کی طرح ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔ اس کا قہقہہ دور دراز پھیلے ہوئے پربتوں سے ٹکرا ٹکرا کر گونجتا رہا۔ پھر وہ اچانک رک کر بڑی گہری اور سنجیدہ آواز میں بولا۔

''میں تو خود ہی اپنی منزل ہوں۔ میری زندگی میں نہ تو کوئی سفر ہے اور نہ رختِ سفر۔''

''تم خود ہی اپنی منزل ہو۔'' بیگ والے نے یہ الفاظ میکانکی انداز میں یوں دہرائے جیسے انھیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''ہاں میں خود اپنی منزل ہوں'' برہنہ شخص اب کی بار بڑے زور سے چیخا تھا۔

''تو پھر ادھر کہاں جا رہے ہو۔'' بیگ والے کے لہجے میں بھی اب جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

''میں تو ہر جگہ موجود ہوں'' برہنہ شخص نے اپنے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے خلاء میں کچھ اس انداز سے جھانکا کہ جیسے آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہو۔

برہنہ شخص کی باتیں بیگ والے کے لئے اب پھر نا قابل فہم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس لئے اس نے ایک پاگل کے ساتھ باتوں میں وقت برباد کرنے کی بجائے سفر جاری

رکھنے میں ہی بہتری سمجھی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ برہنہ شخص بھی غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہا تھا...... شاید اس لئے کہ ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی یا شاید اس لئے کہ ابھی اسے اس سے بہت کچھ کہنا تھا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ نہ جانے کس خیال نے بیگ والے کے ذہن میں ڈنک مارا کہ وہ ایک دم اس کی طرف مڑتے ہوئے بول اٹھا:

''تمہارے کپڑے؟''

''میں نے اب خود کو اوڑھ لیا ہے'' اس نے اتنی سرعت کے ساتھ جواب دیا کہ جیسے وہ بہت دیر سے اس سوال کا منتظر ہو۔

''کیا خود کو اوڑھ لینے کے بعد انسان تمہاری طرح برہنہ ہو جاتا ہے۔''

''ہاں...... پھر وہ تمہاری طرح اشرف المخلوقات نہیں رہتا'' برہنہ شخص کے لہجے میں بلا کی زہرناکی تھی۔

''اور پھر اس کے معروضی رشتے بھی تو ختم ہو جاتے ہوں گے؟'' یہ بیگ والے کا پہلا وار تھا۔

''پھر اسے سب کچھ اپنے ہی آپ میں نظر آنے لگتا ہے۔'' برہنہ شخص نے وار کو بڑی خوبصورتی سے روکنے کی کوشش کی۔

''کیا خدا بھی؟''

اس کا جواب تو تم منصور سے کب کا پا چکے ہو۔''

ان کی گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ وہ اب پھر آہستہ چلنے لگے تھے۔ دونوں اپنے اپنے خیالات میں محو نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے کہ ایک بار پھر برہنہ شخص کی آواز اُبھری۔

''سنو''

بیگ والے نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیسے؟''

''تم جسے برسوں سے کندھوں پہ اٹھائے پھر رہے ہو۔''

''یہ تو میری منزل کی نشاندہی کرتا ہے دوست۔ اس کے بغیر تو میں کہیں بھی نہیں

پہنچ سکتا۔"

"تمہارا باپ بھی یہی سوچ کر اسے عمر بھر اٹھائے پھرتا رہا اور جب اس کے شانوں میں اسے اٹھانے کی سکت نہ رہی تو اس نے یہ تمہارے کندھوں پر ڈال دیا۔ اب تم اسے اٹھائے پھر رہے ہو اور جب تمہارے شانے بھی شل ہو جائیں گے تو تم اسے دوسروں کے کندھوں پر ڈال دو گے اور اس طرح یہ بوجھ نسل در نسل، شانہ در شانہ منتقل ہوتا رہے گا۔"

"اسے کندھوں پر لادر کھنے میں جو لذت ہے، اسے تم کیا جانو۔"

"تم سرابوں کا تعاقب کر رہے ہو دوست۔" برہنہ شخص چڑھ گیا تھا۔

"میں تو صرف تعاقب ہی کر رہا ہوں ......" بیگ والے نے تھوڑی دیر رک کر بات بڑھائی۔ "لیکن تم، تم تو خود اپنے لئے ایک سراب بن چکے ہو۔ تم زیادہ دیر تک خود کو دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"تمہاری منزل کہاں ہے؟" برہنہ شخص نے دفعتاً موضوع بدلا۔

"جدھر میں جا رہا ہوں ......اور تمہاری؟" بیگ والے کی آواز میں طنز کی مبہم سی آمیزش تھی۔

"میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔" نہ جانے کیوں برہنہ شخص اپنے متعلق کئے گئے ہر سوال سے کترا کر نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب کی بار بیگ والا بھی اسے دبوچنے کے لئے پہلے سے ہی دام پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے بڑے زہریلے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"تو سنو" میں تمہیں تمہاری حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں۔" وہ تھوڑی دیر کے لئے پھر رکا۔

"تم جسے اوڑھنا کہتے ہو وہ محض ایک فرار ہے۔ تم حقائق سے آنکھ ملانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔"

"یہ جھوٹ ہے" برہنہ شخص جیسے چیخ اٹھا۔

یہ جھوٹ نہیں سچ ہے۔ تم اپنے خول میں سمٹ کر سوچ رہے ہو کہ تم نے خود کو محفوظ کر لیا۔ حالانکہ تمہارا خول خود ہر لمحے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ تم اپنے وجود کی گرتی ہوئی دیواروں کے ملبے کے نیچے دب جاؤ گے اور آنے والی نسلیں تمہارے وجود کے کھنڈروں کو

دیکھ کر تمہاری بے بسی پر آنسو بہایا کریں گی۔"

"بے بس میں نہیں بلکہ تم ہو اور اس کا ثبوت ہے تمہارے کندھوں پر لدا ہوا یہ بوجھ جسے تم صدیوں سے اٹھائے چلے آرہے ہو اور میں...... ہاہاہا...... ہاہاہا......" برہنہ شخص نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "میں ہوا کی طرح آزاد اور آسمانوں کی طرح بلند ہوں۔"

"جنھیں تم اپنی آزادی اور بلندی کی علامتیں بتا رہے ہو وہ بذات خود نہ تو آزاد ہیں اور نہ بلند۔ حقیقت یہ ہے کہ تم خود بھی نہیں جانتے ہو کہ تم کیا ہو۔"

"میں کچھ بھی ہوں لیکن تمہاری طرح لدو گھوڑا نہیں۔" برہنہ شخص کی انا کو بیگ والے کے چبھتے ہوئے فقروں نے اس حد تک مجروح کر دیا تھا کہ اب وہ ہر بات کا بڑے بپھرے ہوئے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

"کاش یہ حقیقت ہوتی، تم خود اپنی لاش اٹھاتے پھر رہے ہو اور تمہیں اس کی خبر تک نہیں۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔" بیگ والے نے بھی شاید اس کی انا کی دھجیاں اڑانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"تمہاری یہ باتیں مجھے گمراہ نہیں کر سکتیں۔" برہنہ شخص کسی زخمی سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے بولا۔

"گمراہ تو اسے کیا جاتا ہے دوست کہ جس کی کوئی راہ ہو۔ لیکن تم......" وہ بڑے تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔ "تم تو مجسم منزل ہو۔"

وقت گزرتا رہا۔ دن مہینے اور پھر کئی سال گزر گئے۔ وہ دونوں چلتے رہے...... چلتے رہے۔ چونکہ برہنہ شخص ساتھ تھا اس لئے بیگ والا شہروں اور وادیوں سے کتراتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے برہنہ شخص کے ساتھ دیکھ لے۔

ایک روز کسی نشیب سے گزرتے ہوئے اچانک ایک زخمی کتا انھیں سڑک پر پڑا ہوا مل گیا۔ بیگ والے نے قریب جا کر اسے دیکھا، بیگ سے جڑی بوٹیاں نکال کر اس کی مرہم پٹی کی اور پھر اسے اٹھا کر اپنے دوسرے کندھے پر رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ برہنہ شخص جو اس دوران اس سے خاصا آگے نکل گیا تھا، کتے کو بیگ والے کے کندھے پر دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔

"ارے اسے کہاں اٹھا لائے، تمہارے کندھوں پر پہلے ہی کیا کم بوجھ ہے۔"

’’میرے کندھے تمہارے کندھوں کی طرح کمزور نہیں ہیں دوست‘‘ بیگ والے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور برہنہ شخص سٹپٹا گیا۔

وقت کھسکتا رہا۔ بیگ والے کی کوشش سے کتا اب صحت یاب ہو چکا تھا بیگ والے نے اسے چھوڑ دیا لیکن وہ بدستور ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کچھ وقت کے بعد انھیں پہلے کی طرح ہی پھر ایک بندر راہ میں پڑا ہوا ملا۔ وہ بھی سخت بیمار تھا۔ بیگ والے نے اسے بھی اٹھالیا اور تب تک لئے چلتا رہا جب تک کہ وہ بھی پوری طرح صحت یاب نہ ہو گیا۔ اب بندر بھی ان کے ہمراہ تھا۔

دن گزرتے رہے۔ برہنہ شخص اب بھی غیر ارادی طور پر اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ دونوں مختلف سمتوں اور راستوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ عجیب عجیب منزلوں سے ان کا گزر ہوا۔ ایک صبح جب برہنہ شخص بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ بیگ والا معمول کے برخلاف ابھی تک سو رہا تھا۔ یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ برہنہ شخص بیگ والے سے پہلے بیدار ہوا تھا۔ اس نے بیگ والے کو جگانے کے لئے جب اسے جھنجوڑنے کی کوشش کی تو اس نے دیکھا کہ وہ مر چکا ہے۔ بندر اور کتا دونوں اس کے پاس موجود تھے۔ برہنہ شخص کچھ دیر کے لئے تذبذب کے عالم میں بیگ والے کے پرسکون چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر شانے جھٹک کر ایک سمت کو روانہ ہو گیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ بندر اور کتا دونوں اب اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیں گے لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ دونوں اس کے وجود سے قطعی بے نیاز بدستور بیگ والے کی لاش کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے جیسے اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس نے انھیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور اسے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ بیگ والے میں کوئی خصوصیت ایسی ضرور تھی جو اس میں خدا بن کر بھی پیدا نہ ہو پائی تھی۔ اس کے ذہن کو ایک شدید جھٹکا سا لگا لیکن شاید ابھی وہ ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے ایک بار پھر شانے جھٹک کر آگے بڑھنے لگا۔ اس کا یہ عمل اس انسان کے عمل کی طرح تھا جو اپنی کمزوریوں کو بھی انا کا رنگ دے کر خود کو فریب دینے کی کوشش کرتا ہے۔

’’اب وہ کہاں اور کدھر جائے‘‘ پہلی بار اس کے ذہن میں اس سوال نے سر اُبھارا آج تک وہ محض بیگ والے کے ساتھ چلتا رہا تھا اور نہ اسے یوں تو کہیں بھی جانے کی

ضرورت نہ تھی کیوں کہ وہ تو اپنی منزل آپ تھا۔ ''منزل......منزل......منزل'' اس نے بار بار من ہی من میں اس لفظ کو دہرایا۔ کیا واقعی وہ خود ہی اپنی منزل ہے؟ اس نے اپنے نفس میں جھانکا اور تب پہلی بار اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے اندر کتنا وسیع خلا پیدا ہو چکا ہے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اپنے وجود کے اندر بھائیں بھائیں کرتے ہوئے خلا کی اور منہ کرتے ہوئے وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔

''میں خود ہی اپنی منزل ہوں'' شاید اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس کی آواز وجود کی گہرائیوں سے ایک انمٹ بازگشت بن کر ابھرے گی اور پوری کائنات پر چھا جائے گی۔ لیکن وہاں تو اس طرح کی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس کی چیخ کو نہ جانے کس نے نگل لیا تھا۔ اس کا اپنا وجود اس کا ساتھ یوں چھوڑ دے گا۔ اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

''میں خداؤں کا خدا ہوں'' اس نے خلا کی طرف رُخ کرتے ہوئے ایک اور چیخ اچھالنے کی کوشش کی لیکن وہاں تو سکوت کی خدائی تھی۔ آواز کے بھتنوں کا گزر کیسے ہوتا۔ پھر یہ نہ جانے کیا ہوا کہ اسے اپنا وجود کچھ سکڑتا ہوا سا محسوس ہوا۔ وہ رنگ روپ جسے اس نے آج تک ایک خول کی طرح اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا پگھل گیا اور اس کے اندر سے ایک نیا وجود نمودار ہوا......سنگ مرمر کی کسی دیوار پر رینگتی ہوئی چیونٹی جیسا......کمزور......بے حقیقت......اور ہوا کے ایک معمولی سے جھونکے سے ٹوٹ پھوٹ یا بکھر جانے والا۔

اس نے ایک جھرجھری سی لے کر اپنے وجود کا جائزہ لیا......لاکھوں من مٹی نہ جانے کہاں سے اڑ اڑ کر اس کے وجود پر جم گئی تھی۔ وہ لوٹ آیا۔

بیگ والے کی لاش کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا بندر اور کتا دونوں بدستور وہیں موجود تھے۔ البتہ اب وہ اس سے بے نیاز نہیں تھے بلکہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اب انھیں تھپکنے یا پچکارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے اس نے بھی اس طرح کے کسی عمل کا مظاہرہ کئے بغیر آگے بڑھ کر بیگ اٹھا لیا اور اسے اپنے کندھے پر جماتے ہوئے ایک سمت کو روانہ ہو گیا۔

بندر اور کتا دونوں اب اس کے ہمراہ تھے۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ

ہوا

پہاڑ کا نصف حصّہ چڑھنے کے بعد ہم ایک بڑے پتھر کے سامنے ستانے کے لئے رک گئے۔ پو پھٹ گئی اور لمحہ بہ لمحہ صبح کا اُجالا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف نظر ڈالی۔ ہرے بھرے ڈھلوان، کھیت، چراگاہیں، پُرانے قلعے کا کھنڈر، پہاڑی پر واقع مندر، اسکول کی پرانی شکستہ عمارت جہاں میں نے پانچویں جماعت تک پڑھی تھی۔ چٹیل میدان، تنگ گلیاں جہاں ہم نے اچھے اور بُرے دن گزارے تھے۔

میری نظر بے ساختہ اپنے مکان پر پڑی جو سفیدہ اور بید کے درختوں کے درمیان چُھپا ہوا تھا۔ چھت پر گھاس کے گچھے اور گوبر کے اوپلے سکھانے کے لئے قرینے سے رکھے نظر آرہے تھے۔ دودھیل جرسی گائے ناند میں گھاس چر رہی تھی، باغیچے کے پاس سبز تلّے پر گھوڑا اگلے سے بندھا تھا۔

میری نظر چھچلتی ہوئی چھوٹے سے آبائی قبرستان پر پڑی جہاں میرے ابّا اور اجداد مدفون تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔

'ابا'، ہم آج تمہیں چھوڑ کر اس گاؤں سے جا رہے ہیں۔ اپنی خوشی سے نہیں۔ بلکہ مجبوری کے عالم میں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے گاؤں کو الوداع کہا۔

میری بیوی اور بیٹی کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ کچھ دیر تک سُستا کر ہم دوبارہ چڑھنے لگے۔

سونم کے الفاظ ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ کوئی ڈھائی تین گھنٹہ پہلے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر چپکے سے میرے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ سہما سہما سا لگتا تھا اور ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر سرگوشیانہ انداز میں بیٹھا تھا............ ''صدیق تمہارے لئے ایک بُری خبر ہے۔''

سہمے سہمے ہم اس کا منہ تاکنے لگے۔

''تمہیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا''۔

''ابے مذاق نہ کر''۔ میں نے اپنے عزیز دوست سونم سے کہا۔

''مذاق نہیں...... میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ...... ابھی ...... اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔''

''کیوں......؟''میں چلاّ پڑا۔

''اس کیوں کا اس وقت میرے پاس جواب نہیں ہے صدیق''۔ یہ کہتے ہوئے آنسو کا ایک قطرہ اُس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ میری بیوی اور بیٹی رونے لگیں۔

''آخر ہم سے کیا قصور سرزد ہوا ہے؟ کون سا ہم نے جرم کیا ہے؟''

''قصور نہ تمہارا ہے اور نہ ہمارا۔ یہ ہوا شہر سے آئی ہے۔''

''تمہیں کس نے کہا۔''

''مجھے ٹشی نے کہا۔ ٹشی کو دُورجے نے بتایا تھا۔ دُورجے کو چھینگ نے اور چھینگ ...... ٹشی بتا رہا تھا کہ یہ بات تم کسی کو نہ بتاؤ ورنہ یہ لوگ اُس کے مکان کو جلا دیں گے۔''

''یہ لوگ۔''

''ہاں شہر سے آئے ہوئے یہی لوگ کہتے ہیں کہ تم اپنا مذہب یا گاؤں دونوں میں سے ایک چھوڑ دو۔ صدیق ایسی ہوا انسان لاتا ہے۔''

سونم کا اندازِ بیان بڑا پُراسرار تھا۔ ہم حیران تھے کہ اچانک یہ کیسے ہوا، گاؤں والے کل تک ہم پر بڑے مہربان تھے۔ ہم تین پشتوں سے یہاں آباد ہیں۔ تنگ کرنا تو درکنار، ہر ایک نے ہمیشہ ہمیں پیار و محبت دیا تھا اور ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوا تھا۔

''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا سونم۔''

''کاش ایسا ہوتا۔''

پھر وہ میری بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بھابی، یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے۔ ابھی نکلنے کی تیاری کرو۔''

چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''پہاڑ سے نکل جاؤ صدیق اور شہر پہنچ جاؤ۔''

''اس اندھیری رات میں کیسے پہاڑ سے جائیں؟''

"راستے سے جانے میں خطرہ ہے۔" سونم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور دروازے کے پیچھے غائب ہوگیا۔ وہ ایک چور کی طرح آیا تھا۔ اور چور کی طرح نکل گیا۔

ہم نے بیوی کے زیورات، کچھ کپڑے اور چند ضروری چیزوں کی تین پوٹلیاں بنائیں، کچھ سُوکھی روٹیاں اٹھائیں، ناند کو گھاس اور چارے سے بھر دیا۔ گائے اور گھوڑے کو پگّے سے باندھ دیا۔ بھیڑ بکریوں کے لئے باڑے میں گھاس ڈالی اور نالہ پار کر کے پہاڑ کی طرف بڑھے۔

سُورج کی زرد کرنیں پہاڑ کی اونچی چوٹی پر لرزنے لگیں اور کچھ وقفے کے بعد ایک پہاڑ کی اوٹ سے سورج نکل آیا۔ چوٹی سے ہم سوڈیڑھ سو قدم نیچے رہ گئے تھے کہ ہم نے دماموں کی آواز سُنی اور اُس کے ساتھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دھیما دھیما شور بھی سُنا۔ ہماری ٹانگیں اپنی اپنی جگہ رک گئیں۔ چند ہی لمحوں میں درختوں کی جُھنڈ سے لوگوں کی ایک بھیڑ نکلی۔ ہم ایک چٹان کی اوٹ میں چُھپ گئے۔ بھیڑ آگے بڑھنے لگی اور نعروں کی آواز آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے چاروں طرف تیز و تند آندھیاں چل رہی ہیں۔ سونم ٹھیک کہتا تھا کہ ہوا انسان لاتا ہے۔

پانچ دہے پہلے شہر سے ایک ہوا آئی۔ جس نے اپنے ساتھ چیچک کی متعدی بیماری لائی، بیسوں چراغ بجھ گئے۔ گھر اجڑ گئے۔ میری دادی اماں، باجی اور چھوٹا بھائی اس کے شکار ہوئے۔

پھر پروا تھی یا بادِ بہار، آزادی کا پیام لائی۔ دل کش جھونکے چلے۔ تعلیم کا اُجالا پھیلا، بجلی آئی، پینے کا صاف پانی آیا۔

لیکن یہ ہوا بالکل مختلف تھی۔ بادِ صرصر اور بادِ سموم کی طرح۔ گاؤں میں ایسی ہوا کبھی نہیں چلی تھی۔ یہ ہوا اُس ہوا سے بھی موذی اور زہریلی تھی۔ جس نے چھوت کی بیماری لائی۔ اُس ہوا نے انسان کی جانیں لی تھیں، لیکن انسان اور انسان کو جدا نہیں کیا تھا۔

بھیڑ آہستہ آہستہ میرے مکان کی طرف بڑھنے لگی۔ لوگ اکثر میرے لئے اجنبی تھے۔ بھیڑ میں، مَیں نے اپنے ہمسایہ دورجے کو دیکھا۔

"دورجے!" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ابّا، وہ دیکھو.........جلوس میں سونم بھی ہے۔" میری بیٹی چلاّ پڑی۔

''یہ نہیں ہوسکتا........سونم کبھی نہیں آئے گا۔''میں نے کہا۔

''وہ دیکھو ناابّا........جس نے جھنڈا اُٹھایا ہے وہ سونم ہی تو ہے۔''

سچ مچ، جھنڈا اُٹھانے والا سونم تھا۔

''وہ دیکھوابّا، چچا چھینگ اور ٹشی بھی جلوس میں ہیں۔''میری بیٹی چلائی۔

''آہستہ بولو فاطمہ۔''میری بیوی نے سرزنش کی۔

اپنے جگری دوست چھینگ اور ٹشی کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

جلوس مکان کے سامنے رک گیا۔ اور اشتعال انگیز نعرے بلند کرنے لگا جو پہاڑوں سے ٹکرا کر خوف و ہراس کا سماں پیدا کرنے لگا۔ ہر نعرہ کے جواب میں سونم، دورجے، چھینگ اور ٹشی کے ہاتھ فضا میں بلند ہوتے تھے۔

جلوس میں حصّہ لینے والے اکثر لوگوں کو غالباً یہ خیال تھا کہ میں اور میرے بیوی بچے مکان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جب مکان سے کوئی نہیں نکلا تو متعدد لوگ مکان میں گھس گئے، ان میں سونم، دورجے، چھینگ اور ٹشی بھی تھے۔

کچھ دیر بعد جب یہ لوگ باہر نکلے تو ان کے ساتھ میرے گھر کا لوٹا ہوا سامان تھا۔ سونم نے گیس سلنڈر اور چولہا اٹھایا تھا۔ ٹشی نے بڑی دیگ اٹھائی تھی۔ جو گاؤں کے ہر تیوہار اور دعوت پر مجھ سے مستعار لی جاتی تھی۔ دورجے نے بغل میں کوئی چیز دبائی تھی۔ شاید قالین تھا۔ چھینگ نے ناند کے کِلّے سے باندھی رسّی تڑائی اور گائے کو ہانک کر کے لیا۔ ایک آدمی نے گھوڑے کو سنبھالا، دو آدمی بھیڑ بکریوں کو باڑے سے نکال لائے۔ اور ایک طرف لے گئے۔ ایک آدمی تنبو کے بوجھ تلے دبے دبے گزرنے لگا۔ دوسرا بھاری ٹرنک اٹھائے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں آیا۔ میری بیوی اور بیٹی چٹان کی اوٹ میں چُھپ کر آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

کیا کل رات سونم نے ہمارے سامنے مگر مچھ کے آنسو بہائے تھے؟

کیا چھینگ، ٹشی اور دورجے۔ نے مجھے گھر سے بے گھر بنانے کے لئے یہ سازش رچائی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دنیا کتنی بے وفا ہے۔ اور دوست کیسے طوطا چشم ہیں۔

ابھی میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈھ رہا تھا کہ مکان کی ایک کھڑکی سے دھواں نکلا اور آن کی آن میں سارا مکان آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے

لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میری بیوی چیخ پڑی۔

''خدا کا شکر کرو خدیجہ، ہماری جان محفوظ ہے۔''

پھر بھیڑ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگی۔ اور ہم چٹان کی اوٹ میں سے نکلے۔ اور چھپتے چھپتے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے۔ تھکاوٹ اور بھوک نام کی چیز بالکل ختم ہوگئی تھی۔

دوسرے روز شام کے وقت ہم شہر پہنچے جہاں ہم نے اپنے جیسے کئی اور پناہ گزیں دیکھے۔ ہمارا گاؤں سے بالکل رابطہ ٹوٹ گیا، اور کچھ خبر نہیں ملی کہ کھیت کھلیان، باغ اور مویشیوں کا کیا حشر ہوا۔ ایسے میں دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز میں نے سونم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میرے دل میں نفرت اُمڈ آئی اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''اب کیا لینے آئے ہو؟'' یہ کہہ کر میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔

''صدیق، مجھے افسوس ہے۔ ہم تمہارا مکان اور سارا سامان بچا نہیں سکے، ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ لوگ تمہارے مکان کو آگ نہ لگائیں۔ لیکن ہماری کوشش بے کار گئی۔ البتہ تمہارا گیس سلنڈر اور چولہا میرے پاس ہے۔ ٹشی کے پاس دیگ ہے۔ دورجے نے دو قالین بچائے ہیں۔ چھینگ نے تمہاری گائے پال رکھی ہے۔ اس رات ہم چپکے سے تمہارے نیم جلے مکان کو دیکھنے گئے۔ کچھ برتن بھانڈے اور اناج کی دو بوریاں بچائیں۔ جو ہم نے حفاظت سے رکھی ہیں۔ یہ سب ہمارے پاس تمہاری امانت ہیں۔ ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب تم گاؤں لوٹ کر آجاؤ۔ ہماری آنگموں اور دُورجے کی بیوی ڈولماں کہتی ہیں کہ فاطمہ اور خدیجہ کے بغیر گاؤں سونا سونا لگتا ہے۔

بادِ نسیم تھی بادِ صبا، ایک لمبی مدّت تک بعد میں نے ہوا کا ایک دلکش جھونکا محسوس کیا۔

☆☆☆

حسن ساہو

تارکول کا ڈرم

عیدگاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ نمازِ عید شروع ہونے میں صرف چند گھڑیاں باقی تھی۔ نئے، اجلے اور بھڑ کیلے لباس میں ملبوس لوگ احترام سے صفوں میں براجمان پیش امام کی تمہیدی تقریر سننے کے لئے بیتاب تھے۔ کچھ لوگ خلاف توقع آپس میں مختلف موضوعات پر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ کی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے جوتوں پر مرکوز تھیں جوتوں، سلیپروں، اور چپلوں کے تلوے ملے ہوئے تھے اور صفوں کے سامنے سجدے کی جگہ سے ایک انچ آگے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ نمازی دلہن کی طرح سجائے بچے اپنے ساتھ لائے تھے۔

مولوی صاحب کی صحت قابل رشک تھی۔ مائکروفون اگر نہ بھی ہوتا تب بھی ان کی گرجدار آواز آخری صف تک ضرور پہنچ جاتی۔ ان کی تقریر کا نفس مضمون کچھ اس طرح تھا:

"دین اسلام مساوات اور رواداری کا علمبر دار ہے۔ اللہ کے حضور سب کے سب برابر ہیں۔ کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر فوقیت نہیں...... اسلام نے امیر و غریب، گورے و کالے اور رنگ و نسل کی تمیز ختم کر دی ہے۔ دولت، عہدہ یا مرتبت کی بنیاد پر کسی ایک کو فضیلت ملنے والی نہیں۔ پروردگار کو فقط تقویٰ و پرہیز گاری پسند ہے...."

آخری صف میں براجمان ایک سیاہ فام شخص اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا وہ ایک دراز قد نوجوان تھا۔ آنکھیں روشن لیکن اندر کو دھنسی ہوئی اور چہرہ سپاٹ۔ اس کے لباس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ زندگی کا بوجھ اٹھاتے اور سہتے اس کی ریڑھ کی ہڈی کمان کی طرح خم دار ہو گئی تھی غیر ارادی طور پر وہ آگے بڑھا۔ "بیٹھ جاؤ کالے۔" ایک دبلے پتلے شخص نے سیاہ فام کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ "ابے کیا بندریا تلاش کر رہا ہے؟" سیاہ فام شخص نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ساتھ ہی وہ اگلی صف میں کھڑا ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ "دور ہٹ یار" بھاری بھر کم شخص نے اس کو ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ "تو آدمی ہے یا

تارکول کا ڈرم؟" سیاہ فام شخص خاموش رہا۔ اور خاموشی سے اس صف سے نکل کر اگلی صف میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ "اوہو بڑے ہی احمق ہو۔" ایک عمر رسیدہ شخص نے بہت ہی غصے سے کہا "شرم نہیں آتی اپنا غلیظ پاؤں میرے اجلے سلیپر پر رکھ دیا ہے؟" سیاہ فام شخص نے عمر رسیدہ بزرگ کے غصے کو نظر انداز کر دیا اور اس صف سے بھی نکل کر اگلی صف میں پہنچ گیا۔ پاس والے خوش باش شخص نے نفرت کی نظروں سے گھور کے اچانک اپنا جوتا اٹھایا۔ اور اگلی صف میں چل دیا ساتھ ہی اس کی زبان بھی چلنے لگی۔ "ابے بد بخت بندگی میں بھی روڑے اٹکاتا ہے۔"

اتنے میں صلوٰۃ کے ساتھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ اور اللہ اکبر کی اونچی آواز کے بعد نماز شروع ہو گئی۔ سیاہ فام شخص بت بنا کھڑا سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کی اس اسلامی قدروں سے لبریز باتوں کو لوگ اس سرعت کے ساتھ کیوں فراموش کر گئے؟

☆☆☆

خالد حسین

ہاتھی اڑھائی لاکھ کا

کہتے ہیں کہ زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا سوا لاکھ کا ہوتا ہے، لیکن جس ہاتھی کی آپ بیتی میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں، وہ ہمارے کسی سیاسی لیڈر کی طرح سفید نسل کا ہاتھی نہیں ہے، جو اپنے ذاتی مفادات کے لئے لوٹ مار مچانے اور قوم کا بیڑا غرق کرنے کے باوجود بھی بڑا مہنگا بکتا ہے۔ ہماری داستان کا ہیرو.... ایک سیدھا سادا یعنی سادھارن قسم کا ہاتھی ہے۔ جس کا رنگ کالا مٹیالا، پنکھے جیسے دو کان، ایک موٹی سونڈھ، ایک پونچھ، چار موٹی موٹی ٹانگیں، دو چھوٹی آنکھیں اور کچھ دانت کھانے کے اور دو دکھانے کے یعنی بالکل اصلی اور خالص دراوڑی نسل کا ہاتھی۔ اس ہاتھی نے جنوبی ہند کے جنگلوں میں جنم لیا۔ اس کے ماں باپ، دادے اور لکڑ دادے سبھی جنوبی ہند کے جنگلوں میں ہی پیدا ہوئے اور انہی جنگلوں میں گھاس، پتے، جڑی بوٹیاں اور پھل کھا کر جوان ہوئے اور آزادی کے ساتھ زندگی گزار کر اس جہان فانی سے چلے گئے۔ اس ہاتھی کا ذرا سا ماضی بتانے کا مطلب قارئین کو بڑی عاجزی کے ساتھ یہ جانکاری دینا ہے کہ یہ ہاتھی شدھ بھارتی ہے، افریقہ، امریکہ، چین یا جاپان سے نہیں آیا۔ یہ کسی اور ملک کا بھی گھس پیٹھیا نہیں ہے۔ یہ نرول بھارتی ہے اور بھارتی سنسکرتی میں ہی پروان چڑھا ہے۔ بھارت ماتا کے سپر منوں اور بھارت کی اکھنڈتا کے رکھوالوں سے گزارش ہے کہ وہ اس ہاتھی کے بھارتی ہونے میں ذرا شک نہ کریں۔ اس کے پریوار کا اندراج جنگل کے بندوبستی ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ آزادی کے بعد جنگلی جانوروں کی ووٹر لسٹوں میں اس کے والدین کا نام درج چلا آ رہا ہے۔ لیکن خوش قسمتی یا بد قسمتی سے جنگل میں جمہوری نظام چلانے کے لئے اور اپنی پسند کی حکومت چننے کے لئے اس کو کبھی ووٹ ڈالنے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا۔ کیونکہ چھوٹی عمر میں ہی یہ معصوم انسان کے شیطانی جال میں پھنس گیا اور اس کے دکھائے ہوئے سبز باغ میں چارہ چرنے لگا۔ اس سبز باغ کا نام تھا "بنجارا سرکس"...... باہر سے دیکھنے میں وہ ایک چمک دمک والی سرکس تھی۔ لیکن اندر سے ایک

طبیلہ جس پرواٹر پروف ترپال کا ایک بڑا طنبو لگا ہوا تھا۔ طبیلے میں اس ہاتھی کے علاوہ دو ریچھ، تین لنگور، چار بندر، پانچ طوطے، چھ کبوتر..... ایک شتر مرغ، ایک شیرنی دو شیر کچھ بطخیں.... اور اپنے مستقبل سے مایوس چند فنکار، اکھٹے دانا پانی چرتے تھے، اور پر بھو کے گن گاتے تھے۔ اس طبیلے میں رہنے والے سبھی کلاکاروں کی خواہشوں کے کچے برتن اکثر ٹوٹتے رہتے تھے۔ کیونکہ پیوند لگے طنبوں میں کچے برتنوں کا ٹوٹنا اُن سب کا مقدر تھا .....ہمارا ہاتھی بھی بنجارا سرکس کے سبز باغ میں قید ہو کر گھر سے بے گھر ہو گیا اور شہروں کی رنگ برنگی اور کلچرڈ زندگی میں در بدر پھرنے لگا۔ اس سرکس کے مالک قادر یار نے ہاتھی کا نام راجو رکھا تھا۔ راجو مہاوت کے سکھائے گئے کرتب دکھا کر لوگوں کی دلچسپی کا سامان بن گیا اور قادر یار کے لئے کمانے کا وسیلہ۔ ہمارے ہاتھی کی دُکھی داستان تب شروع ہوئی جب قادر یار کی سرکس نے جموں کے نزدیک اور پاکستانی سرحد کے بالکل سامنے موضع ارنیہ میں اپنا ڈیرا جمایا..... ہوا یوں کہ ایک دن کڑکتی دوپہر کے وقت راجو اپنے مہاوت کی ہدایت کاری میں کھیتوں میں سبز چارہ کھا رہا تھا اور جنگل راج میں پھیلی برائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے کچھ نٹ کھٹ بالک اُسے تنگ کرنے لگے۔ راجو کو سخت غصہ آیا۔ اسے شاید زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا ورنہ وہ بیچارا ہمیشہ کام، کرودھ اور مایا سے پرہیز کرتا تھا۔ غصے کو پی جانے کے لئے وہ دوڑنے لگا۔ وہ دوڑتا رہا۔ مہاوت اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ اُس نے ہاتھی کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ اُسے سمجھایا کہ آگے نہ جا۔ آگے پاکستان کی پاک سرزمین ہے۔ وہاں جانے سے سرحد کی خلاف ورزی ہو گی اور سرحد کی خلاف ورزی پر تو پکڑا جائے گا۔ تجھے کوڑے کھانے پڑیں گے۔ لیکن ہاتھی بیچارا ملکی سرحدوں اور اس کی خلاف ورزیوں کو کیا سمجھتا۔ وہ غصہ میں پاکستانی سرحد عبور کر گیا۔ راجو پاکستانی سرحد کے اندر دوڑتا جا رہا تھا اور مہاوت اُسے اپنی سرحد پر کھڑا بڑی یتیمی کے ساتھ آنکھ سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔ مہاوت نے ہاتھی کو اپنے دل سے اوجھل نہیں کیا اور فوراً بنجارا سرکس کے سنچالک قادر یار کو بیتی داستان سنا ڈالی اور راجو کو واپس بھارت ماتا کی گود میں لانے کی سبیل ڈھونڈنے کا مشورہ دیا......!!

قادر یار گھبراہٹ میں سرپٹ دوڑتا ہوا سرحدی حفاظتی پولیس کے چوکی افسر کے پاس گیا اور چھاتی پیٹتے اور بین کرتے ہوئے کہنے لگا: "انسپکٹر صاحب! دہائی ہے دہائی!

میری مدد کریں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ میرا ہاتھی راجو پاکستانی سرحد کے اندر چلا گیا ہے۔ اُسے واپس لانے کے لئے کچھ کریں۔ ورنہ میری سرکس ختم ہو جائے گی۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میرے کلاکار بھوکے مر جائیں گے۔ حضور! کچھ کریں راجو کو واپس لا دیں"۔

تمہارے ہاتھی نے سرحد پار کیوں کی؟ وہ پاکستان میں کیا لینے چلا گیا۔ ڈیفنس آف انڈیا اور پاکستانی سرحدی قانون کے مطابق اُس نے سنگین جرم کیا ہے۔ جس میں اُسے سات سال تک کی سزا ہو سکتی ہے"۔ انسپکٹر صاحب! آپ پہلے اسے واپس لانے کی کوئی ترکیب ڈھونڈیں۔ پھر چاہے جتنی مرضی سزا دیں"۔ "تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارے ہاتھی کا نام کیا ہے؟ آپ دونوں کہاں کے رہنے والے ہو اور کام کیا کرتے ہو؟"

سرکار میرا نام قادر یار ہے اور میرے ہاتھی کا نام راجو ہے یعنی راج محمد۔ میں بنجارا سرکس کا مالک ہوں اور راجو میری سرکس کا سب سے مہنگا اور بہترین کلاکار ہے۔ یہ لوگوں کو اپنے کرتب دکھاتا ہے۔ راجو اور کچھ دوسرے حیوانی اور انسانی کلاکاروں کی بدولت ہی میری سرکس چلتی ہے اور چلتی سرکس کی وجہ سے ہم سب کا روٹی، کپڑے کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ ہم دونوں شدھ بھارتی ہیں۔ اُگروادی ہرگز نہیں ہیں"۔ "قادر یار کا نام سن کر مجھے پورن بھگت کا قصہ یاد آ گیا۔ کیا خوب شعر کہے ہیں۔۔۔۔۔"

حضور! کیا آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟ قادر یار نے پوچھا: "بالکل نہیں" چوکی افسر پھر پوچھنے لگا"۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاتھی کا نام راج محمد کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جناب! بالکل اُسی طرح، جس طرح میرا نام قادر یار ہو سکتا ہے۔ میں نے جیون بخش کے گھر جنم لیا اور قادر یار بن گیا۔ راجو کو میں جنوبی ہند کے جنگلوں سے پکڑ لایا تھا، اس لئے وہ راج محمد بن گیا۔ اگر میں کسی آتما رام کے گھر پیدا ہوتا تو میرا نام کیدار ناتھ ہوتا اور ہاتھی کا نام راج ناتھ۔ ہے نا ٹھیک بات"۔

"ہاں ہاں! ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ راج محمد پاکستانی جاسوس تو نہیں ہے؟"

"بادشاہ سلامت! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہاتھی جاسوس کیسے ہو سکتا ہے۔ بھلا انسانوں کے ہوتے ہوئے جانوروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ جاسوسی کریں۔ دیش کو بیچنے کا کام تو قومی بگلے بھگتوں نے اپنے ذمے لیا ہوا ہے"۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ہم راجو کو ہر حالت میں واپس لانے کی کوشش کریں گے۔ تم

فکر نہ کرو۔ انسپکٹر نے اچھی طرح سے پوچھ تاچھ کرنے اور تسلی ہو جانے کے بعد کہا"۔
اُس نے اپنا وائرلیس سیٹ کھولا اور پاکستانی سرحدی چوکی کے اپنے ہم منصب سے رابطہ قائم کیا۔ "ہیلو! ہیلو! آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"۔
میں پاک رینجرز کا صوبیدار میجر گل زماں خان بول رہا ہوں۔ آپ کون، صاحب ہیں؟" "میں آپ کا ہمسایہ ہوں...... بالکل سامنے والی بھارتی سرحدی چوکی کا انچارج انسپکٹر بلاکی شاہ بول رہا ہوں"۔
"لالہ جی نمستے"۔ "نمستے جی! نمستے۔ ہماری بھی محبتوں والی سلام قبول کریں"۔
"ہاں تو بتائیے، کیا حکم ہے؟ دھمکیوں، جوابی دھمکیوں اور جنگی بخار کے ماحول میں آپ نے ہمیں کیوں یاد کیا؟"
"خان صاحب! ہمارے ایک غریب شہری کی تکلیف دور فرمائیں"۔ "پر لالہ جی! میں کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں ہوں، پھر میں کیسے....."
"خان جی! بات یوں ہے کہ ہمارے ایک مسکین شہری قادر یار کی سرکس کا ہاتھی غلطی سے سرحد پار کر کے آپ کی طرف چلا گیا ہے۔ اُس پاگل کو سرحد کی خلاف ورزی کرنے یا نہ کرنے کی کوئی سمجھ نہیں ہے۔ بالکل چرندوں اور پرندوں کی طرح، دریا، ندی، نالوں کی طرح، حیوانوں اور جانوروں کی طرح..... جس طرح ہم، ہندوستانی اور پاکستانی گائے بھینسیں ایک دوسرے کو خیر سگالی کے ناطے واپس کر دیتے ہیں۔ بالکل اسی پرانے دوستانہ جذبے کے صدقے، ہاتھی کو تلاش کر کے ہمارے حوالے کر دیں۔ بڑا اکرم ہوگا، نوازش اور مہربانی ہوگی......"۔
"اچھا تو یہ تکلیف ہے آپ کے شہری کو۔ لیکن سخت حفاظتی انتظامات کے ہوتے ہوئے آپ کا ہاتھی سرحد کیسے پار کر سکتا ہے۔ سرحد تو آج کل صرف مجاہد اور آپ کی زبان میں دہشت گرد یا اُگروادی ہی آر اور پار کرتے ہیں.....اور اب تو یہ کرما والی سرحد لیڈروں کی دھمکیوں کے مطابق آر پار کی نرنا ئیک لڑائی کا انتظار کر رہی ہے تا کہ سرحد کے دونوں اطراف رہنے والی بدنصیب مخلوق ایک بار پھر خون اگلے اور تباہ ہو، خیر چھوڑیئے ان فضول باتوں کو.... آپ کی طرف سے کوئی ہاتھی ہمارے علاقے میں نہیں آیا ہے۔ آپ کے سپاہیوں کی طرح ہمارے، سپاہی بھی بڑی چوکسی سے سرحد کی نگرانی کر رہے ہیں"۔

''قادر یار! پاکستانی چوکی افسر کا کہنا ہے کہ ہاتھی ان کی طرف نہیں گیا ہے۔اس لئے تم یہاں سرکنڈوں کے پیچھے یا جھاڑیوں میں ڈھونڈو''۔

''میری سرکار! کیا بات کرتے ہیں آپ۔وہ پاکستانی علاقے میں ہی گیا ہے۔میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے سرحد عبور کرتے دیکھا ہے۔میں سچ کہتا ہوں۔آپ پاکستانی افسر پر اپنا ذاتی اثر ورسوخ استعمال کریں۔میں اسے چائے پانی پلانے کیلئے بھی تیار ہوں، لیکن آپ کو اپنے پرماتما کا واسطہ ہے۔میرے خدا کا واسطہ ہے، میرا ہاتھی مجھے واپس دلادیں۔

ہیلو ہیلو! خان صاحب! ہاتھی آپ کی طرف ہی گیا ہے۔ہمارے پاس پکا ثبوت ہے۔آپ مہربانی فرمائیں اور اپنے جوانوں کو حکم دیں کہ وہ ہاتھی کو ڈھونڈ کر پکڑ لائیں۔اس ہاتھی کا مالک بڑا غریب ہے۔پیدائشی یتیم ہے۔ویسے بھی آپ کا مذہبی بھائی ہے۔کردیں اس پر نظر عنایت۔آپ کو اپنے اللہ کی قسم ہے''۔

''اچھا! اچھا! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔آپ اُسے دلاسہ دیں ہم ہاتھی ڈھونڈ لاتے ہیں''۔

وائرلیس پر بات کرنے کے بعد بلاکی شاہ، قادر یار کو دلاسہ دینے لگا لیکن قادر یار مایوسی اور حسرت سے سرحد کی جانب دیکھے جارہا تھا......۔

ایک لمبے انتظار کے بعد پاکستانی رینجرز کے جوان ہاتھی کو بیڑیوں میں جکڑ کر سرحد کے قریب لائے اور اسے شیشم کے ایک مضبوط درخت کے ساتھ باندھ دیا.....دور سے ہاتھی کو دیکھ کر قادر یار بہت خوش ہوا اور دوڑا دوڑا اپنے چوکی افسر بلاکی شاہ کو بلانے چلا گیا۔

بلاکی شاہ نے وائرلیس سیٹ پر پاکستانی رینجرز کے افسر گل زماں خان سے پھر رابطہ قائم کیا۔

''بلاکی شاہ جی! آپ کے شہری کا ہاتھی تو مل گیا ہے لیکن یہ آپ کو تب ملے گا، جب آپ سوالاکھ کی رقم ہمارے حوالے کردو گے۔تاکہ ہم یہ رقم سرکاری خزانہ میں جمع کراسکیں''۔

''خان صاحب! سوالاکھ روپے کس بات کے۔یہ تو اندھیر گردی ہے''۔

''لالہ جی! بات ڈھنگ سے کریں۔آپ کے ہاتھی نے ہمارے گاؤں کی سکولی عمارت توڑ دی ہے اور ہمارے انجینئر نے نقصان کا تخمینہ سوالاکھ روپے لگایا ہے۔چار

کمروں پر مشتمل پکی بلڈنگ تقریباً کھنڈر بن چکی ہے"۔

"پر خان صاحب! یہ غریب شخص اتنی بڑی رقم کہاں سے لائے گا۔آپ ذرا فراخدلی سے کام لیں اور کچھ لے دے کے فیصلہ کرلیں۔قادر یار پانچ ہزار روپے تک دینے کو تیار ہے۔ کہئے! کیا خیال ہے۔ کرلوں بات پکی"۔

نہیں! نہیں لالہ جی، ایسی بات نہ کریں۔سرحد پر لگی، ان خاردار تاروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔آج کل یہ باتیں ہمیں راس نہیں آتیں۔آپ کا ارادہ ہمیں کہیں احتساب عدالت میں پھنسانے کا تو نہیں ہے۔آپ تو جانتے ہیں کہ آجکل سارا معاملہ فوجی بھائیوں کے ہاتھ میں ہے۔اس لئے میں کچھ نہیں کرسکتا"۔

دونوں کی باتیں سن کر قادر یار بے ہوش ہوگیا۔اس کے ماتھے سے ٹھنڈا پسینہ اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔بلاکی شاہ نے اُس کے منہ پر پانی چھڑکا۔پنکھے سے ہوا دی۔ پاؤں کو مالش کی اور اُسے ہوش میں لانے کے لئے آدھا پورن بھگت سناڈالا۔جب قادر یار ہوش میں آیا تو بلاکی شاہ نے اُسے دلی جانے کا مشورہ دیا اور سمجھایا کہ وہ دلی میں وزارت دفاع میں جائے۔وہاں بڑے حاکموں سے ملے تاکہ وہ اعلیٰ سطح پر پاکستانی سرکار کے ساتھ یہ معاملہ اٹھائیں اور اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ہاتھی واپس لاسکیں"۔

قادر یار ٹوٹ چکا تھا۔وہ پریشان حال بنجارا سرکس میں آیا۔اُس نے اپنے مشیروں سے صلاح ومشورہ کیا اور شام جہلم ایکسپریس میں بیٹھ گیا۔جس نے اُسے صبح ٹھیک دس بجے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر اُتار دیا۔وہاں اُس نے تین پہیہ پکڑا اور سیدھا رکھشا منترالیہ پہنچا جہاں ایک چپراسی صاحب کو خوش کرنے کے بعد وہ متعلقہ حاکم کے پاس مع عرضی پیش ہوگیا۔درخواست پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد سیکریٹری صاحب نے قادر یار سے اُس کی دُکھ بھری کہانی سنی....پھر درخواست پر ضروری کارروائی کرنے کا حکم صادر کر کے وہ متعلقہ برانچ میں بھیج دی۔سات دنوں تک قادر یار دفتری کارروائی میں گم رہا۔آٹھویں دن وہ وزیر دفاع سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔اُس نے منتری جی کو رورو کر اپنی آپ بیتی سنائی۔ منتری جی کو جانے قادر یار کی بے کسی والی کونسی ادا پسند آئی کہ اُنہوں نے فائل منگوائی اور اپنی طرف سے ایک چٹھی اپنے پاکستانی ہم منصب کو لکھی اور انہیں تلقین کی کہ وہ بھارتی ہاتھی کو واپس کر کے اُنہیں شکریہ کا موقعہ بخشیں۔ایک مہینے کے بعد پاکستان سرکار کا جواب آیا لکھا تھا۔

"بھارتی ہاتھی نے ہمیں بہت پریشان کیا۔ جب آپ کے ادھیکاریوں نے سکولی عمارت کا معاوضہ نہیں دیا تو ہاتھی کو لاہور کے چڑیا گھر میں بھیج دیا گیا۔ گرفتار شدہ بھارتی ہاتھی کی خبر جب پاکستانی اخباروں میں چھپی تو پورا لاہور شہر اُسے دیکھنے کے لئے اُمڑ آیا اور پاکستانی مہمان نوازی کی شان رکھتے ہوئے لوگوں نے بڑے پیار سے ہاتھی کو اتنے کنوں کھلائے کہ اُس کے اندر سردی جم گئی اور اُسے لقوا مار گیا۔ ہاتھی کا علاج کرایا گیا پاکستانی ڈاکٹروں کی مدد کے لئے آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے دو ماہرین کو بلایا گیا۔ بروقت علاج سے ہاتھی تو ٹھیک ہو گیا لیکن ہماری سرکار کا سوا لاکھ روپیہ ہاتھی کی بیماری پر لگ گیا۔ یوں آپ کا ہاتھی اڑھائی لاکھ کا ہو گیا ہے۔ تفصیل اس طرح ہے:

سکولی عمارت توڑنے کا تخمینہ سوا لاکھ

ہاتھی کی بیماری کے علاج پر خرچہ سوا لاکھ

کل رقم اڑھائی لاکھ

لہٰذا آپ سے گذارش کی جاتی ہے کہ جلد سے جلد اڑھائی لاکھ روپے کا ڈرافٹ حبیب بنک کے نام بھجوا دیں اور اپنا ہاتھی لے جائیں۔ یہ پاکستان سرکار کا آخری فیصلہ ہے اور اس میں کسی تیسرے فریق کی ثالثی قبول نہ ہوگی"۔

خط کی نقل قادر یار کے حوالے کر دی گئی۔ خط پڑھتے ہی قادر یار کو بھی لقوا مار گیا اور سنا ہے کہ آج کل وہ دِلی کے کسی خیراتی ہسپتال میں اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔......

☆☆☆

جان محمد آزاد

عاقبت سنوار چلے

رات بھر کی موسلا دھار بارش کے بعد خوبصورت دِن طلوع ہوا تو ایسا سماں بندھا جیسے زمین اور آسمان ابھی ابھی دھو کے پھیلا دئے گئے تھے۔ گہرے نیلے گگن تلے سبزے سے نمی کی بھاپ آہستہ آہستہ اٹھ رہی تھی۔ درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ تھی، کرم کیلے کے پھیلے ہوئے پتے پر رُکا ہوا بارش کا موٹا سا قطرہ ناتواں تتلی کے شفق رنگ پروں کو چھو گیا تو گویا بے چاری کی جان ہی نکل گئی۔ رات بھر کے بادو باراں نے اُس کی حیات کا چراغ گل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن ممتا کی ماری تیز و تند آندھیوں میں بھی اپنے چھوٹے چھوٹے انڈوں کی نگہداشت سے نہیں چوکی تھی۔ اُس نے ایک حسرت بھری نگاہ سے گرد و پیش کی شاداب فضا کا جائزہ لیا پھر اچانک اُس کی نظر اپنے پاس ہی کرم کلے کے پتے پر رینگتے کیڑے پر پڑی۔

یہ کرم پیلا کی مادہ تھی جو پتے پر اپنی مخصوص بے ڈھنگی چال سے ٹہل رہی تھی۔ جب وہ رینگتی ہوئی تتلی کے پاس پہنچی تو تتلی نے اپنے آنسو روک کر نہایت ضبط سے کہا......۔

"میری ریشمی بہن ......! کیا تم میرے بعد میرے بچوں کو کھلانے کا ذمہ لینے کی زحمت اٹھاؤ گی ......! یہ میرے چھوٹے انڈے ہیں...... بہن ...... میں خود یہ نہیں جانتی کہ ان سے میرے بچے کب تک نکلیں گے لیکن میری سانسیں گنتی کی ہیں۔ اب ان آخری گھڑیوں میں تم سے بہتر نگہداشت کرنے والی کا بھلا ...... کہاں سے انتظام کروں گی......! اے میری سبز یلی بہن ...... تمہیں بچوں کی غذا کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ یہ تمہاری طرح اناپ شناپ غذا کھانے کے متحمل نہیں۔ تمہیں انہیں طلوع آفتاب سے پہلے کی شبنم اور پھر دن میں مختلف اوقات پھولوں کا رس پلانا ہوگا............! میری اچھی بہن! پہلے پہل انہیں محدود پرواز کی اجازت دینا کیونکہ میرے یہ نامراد شہزادے ابتداء میں اپنے پنکھ پوری طرح استعمال نہیں کر سکیں گے......! لیکن تم یوں حیرت سے مجھے کیوں گھور رہی ہو۔ میں

جانتی ہوں کہ تم اڑنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ لیکن اے مہربان بہن۔! میری سانس اکھڑ رہی ہے۔ میں آخری ہچکیاں لے رہی ہوں......! اب میں انہیں تمہاری پناہ میں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ ایک ابدی پرواز پہ......! آؤ آگے بڑھو اور چلا چلی سے پہلے میرے ان شفق رنگ پروں سے یہ احمریں دھول سمیٹ لو۔ یہ میری سوغات ہے......! اُف...... میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے میں............"۔

اس کے ساتھ ہی تتلی نے آنکھیں موند لیں اور کرم پیلا کی مادہ بت بنی اسے گھورتی رہی۔ بے چاری دم توڑتی تتلی سے اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ وہ اتنی حسین مخلوق کی پرورش بھلا کیسے کر سکتی ہے......؟! وہ دیر تک حیران و پریشان کبھی تتلی اور کبھی اُس کے ننھے سے انڈوں کو دیکھتی رہی...... پھر اس نے کرم کلّے سے اُتر کر اوپر کھڑے شہتوت کے درخت سے گری کچھ پتیاں جمع کیں پھر احمریں دھول سمیٹ کر تتلی کے مردہ تن کو ان میں سمیٹ لیا اور یوں گویا اُس کی آخری رسوم ادا کیں۔ تھک ہار کر وہ ہانپتی ہوئی ایک بار پھر کرم کلّے کے پتے پر آ گئی اور تتلی کے انڈوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ جگمگاتی صبح کے اِن۔ اندھیروں میں کرم پیلا کی نحیف مادہ کے نازک کندھوں پر بھاری بپتا آن پڑی تھی......!

"واہ ری قسمت! بے چاری تتلی نے بھی کیا خوب آیا ڈھونڈ نکالی۔ شاید آخری وقت میں بے چاری فہم و ادارک سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ بھلا میری کیا بساط جو اس قدر برتر مخلوق کی نگہداشت کر سکوں۔ میں اندھیری گھپاؤں میں رینگتے والا ایک حقیر کیڑا۔ تتلی کے خواب و خیال سے بھی حسین بچے مجھے کیا خاطر میں لائیں گے۔ وہ کبھی بھی مجھے نظر انداز کر کے اُڑان بھر سکتے ہیں۔ میں حیران ہوں! یہ تتلی اپنی جاذبیت کے باوجود کس قدر بھولی تھی۔ بعض لوگ اپنی بھڑک دار ملبوسات کے باوجود بھی کتنے احمق ہوتے ہیں انہوں نے اپنے پنکھوں پر سونے کا ملمع تک چڑھا رکھا ہوتا ہے......! خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ تتلی بے چاری تو مر گئی اور اُس کے یہ انڈے کرم کلّے کے پتے پر ہی رہ گئے۔ مجھے چار و نا چار یہ فرض ادا کرنا ہوگا......!"

ریشم کے کیڑے کی مادہ کا دل بھی ریشمی تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات انڈوں کی حفاظت کرتی رہی۔ پریشانی میں وہ رات بھر اطمینان سے سو بھی نہ سکی۔ وہ ہر گھنٹے ایک انتہائی فرض شناس چوکیدار کی طرح ننھے ننھے انڈوں کے گرد گشت لگاتی رہی۔ اُسے بس

ایک ہی پریشانی لاحق تھی کہ کہیں انڈوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

آخرشب کا سیاہ شامیانہ ہٹ گیا۔ تخلیق سحر میں کرم پیلا کی مادہ کو آس پاس کے پیڑ قبرستان کے کتبے کی طرح نظر آئے۔ وہ دیر تک سوچتی رہی اور پھر...... اپنے آپ ہی کے ساتھ بڑبڑاتی رہی...... ''کہتے ہیں ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ مجھے کسی عقل مند آشنا سے اس معاملے پر صلاح مشورہ کرنا چاہئے۔ میں تو ایک دم سادہ لوح ہوں بھلا جب تک میں صاحبِ ادراک ہمسایوں سے استفسار نہ کروں تب تک یہ معمہ حل کیسے ہوگا......!''

لیکن اس میں بھی ایک مشکل تھی۔ آخر وہ مشورہ کرے تو کس سے......! وہاں آس پاس کبھی کبھار ایک کھردرے بالوں والا خوفناک کتا دندناتا پھرتا ہے۔ کم بخت کے طور طریقوں میں ہمیشہ تشدد سا جھلکتا ہے۔ اگر کبھی غلطی سے اُسے پاس بلایا گیا تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنی شوخ دُم کو لہرا کر سبھی انڈوں کو توڑ ڈالے۔ نہیں اُس کے متعلق تو سوچنا بھی غلط ہوگا۔ ایک بلی بھی وہی پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ دن میں ایک دو بار شہتوت کے نیچے آکر دھوپ سینکتی رہتی۔ لیکن وہ ایک دم سرد مہر تھی۔ کوئی جئے یا مرے اُس کی بلا سے......! ایسی مخلوق بھلا تتلی کے انڈوں کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا کیوں کرے گی۔ کرم پیلا کی مادہ سوچتے سوچتے پریشان ہوگئی۔

''میں حیران ہوں آخر۔ اتنی بڑی برادری میں کس کی ذات پر تکیہ کروں کون ہے جو مجھے سچا مشورہ دے سکتا ہے......؟''

اچانک فضا کسی پرندے کے ترنم سے مہک اُٹھی۔ کرم پیلا کی مادہ نے جو دیکھا تو شہتوت کی نچلی ڈال پر اُسے شاہین نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جیسے اُچھل پڑی۔ ارے...... اُسے پہلے اِس جانور کا خیال کیوں نہ آیا۔ وہ خود کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ یہ پرندہ نیلے آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز رہتا ہے۔ دُنیا کی اِس شورش گاہ سے دور کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ اس کا آشیاں بھی آسمان میں ہی ہوگا......! اس کی پرواز کس قدر بلند...... اس کی منزلیں کتنی رفعتوں پہ ہے...... اس کی آنکھوں میں کتنی بصیرت ہے......؟ میں غالباً اسی کی تلاش میں تھی۔ اسی کی فہم و فراست سے یہ معمہ حل ہوسکتا ہے......!

شہتوت کی شاخ کے عارضی نشیمن تک ''بھونرا'' کرم پیلا کی مادہ کا پیغام لے آیا۔ پیغام پہنچانے کے بعد بھونرا ایک بار پھر نرگس کے پھول پر منڈلانے لگا۔ لیکن کرم پیلا کی

مادہ بے تابی سے شاہین کا انتظار کرنے لگی۔ بلآخر اس کی نوائے شوق کا طلسم تھم گیا اور پرندوں کی دُنیا کا درویش اپنی پرانی شناسا کے پاس آ گیا۔ اُس کی طلسمی صحبت محسوس کرتے ہی بے چاری مادہ نے ایک ہی سانس میں اپنی ساری رام کہانی سُنا دی اور پھر نہایت اشتیاق سے اُسکی صلاح طلب کی۔

''اگلی بار جب تم اپنی آسمانی پرواز پر جاؤ گے۔اے فلک کے سیلانی۔ تو وہاں تمہیں میری اس اُلجھن کا کوئی معقول حل سجھائی دے گا۔ میں تمہاری اُس تجویز کی منتظر رہوں گی!''

شاہین کی نگاہوں میں غضب کی ملکوتی چمک تھی۔ وہ دیر تک مادہ کی باتوں پر غور و فکر کرتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا۔اے ممتا کی ماری مادہ......!''

یہ نامکمل سی تشفی دیکر شاہین نے اپنے ارغوانی شہپر پھڑ پھڑائے اور آسمان کی بیکراں نیلی وسعتوں کی طرف اڑان بھرلی۔ پھر جیسے وہ ان وسعتوں میں تحلیل ہو کر کھو گیا۔ کرم پیلا کی مادہ نے اُسے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں ہوتا تو نظر آتا......!

نئے دن کی تمام آہٹیں اور رنگ کرم پیلا کی مادہ کے دل میں شبنم کی طرح جذب ہو کے رہ گئے۔ وہ دبے پاؤں اٹھی اور انڈوں کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر نیچے چلی آئی۔ نم گھاس سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ شب بھر کی جاگی بھلا گل گشت کیا کرتی نرم بھینی بھینی گھاس پہ رینگتی وہ مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی ...... جانے کب آئے گا وہ میرا مہربان آزاد پرندہ...... غالباً اِس بار وہ حد پرواز سے بھی کہیں دور نکل گیا۔ نہ جانے کہاں تک۔؟ نیلے آسمان کی عمیق گہرائیوں میں بھلا وہ کیسی آواز سنتا ہوگا اپنے بے پناہ دور کا شانے میں جاتے ہوئے اور اس روئے زمین کی طرف لوٹتے وقت وہ ہر بار کچھ دلفریب ترانے گاتا رہتا ہے۔ ان ترانوں کا ایک لفظ بھی مجھ گنوار کے پلے نہیں پڑتا لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں۔ میں اس سحر انگیز آواز کے ترنم میں کھو جاتی ہوں۔ کبھی اگر اُس سے پوچھنے کی ہمت کی تو اس نے مستور موسموں کی نوید سنانے سے احتراز کیا۔!

کرم پیلا کی مادہ تتلی کے انڈوں کے گرد ابھی دوسرا ہی چکر لگا پائی تھی کہ اُسے دور کہیں شاہین کے اُسی مانوس ترانے کی آواز سنائی دی۔ مادہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آکاش کا بھٹکا سنیاسی لہراتا پھڑ پھڑاتا کرم کیلے کے پھیلے ہوئے پتے کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ اُس کے

تن بدن سے اُمنڈنے والی خوشبوئیں رینگتی بے ڈھنگی مادہ کی روح میں تحلیل ہونے لگیں۔

"اے ممتا کی ماری مادہ۔ خوش ہو جا۔ میں تمہاری درخشندگی کی بشارت لے آیا ہوں لیکن اپنے اعتقاد کی جگنوؤں کو کسی حالت میں بجھنے نہیں دینا۔!"

"تو پھر سُن لو...... پہلی بات جو تم نے مجھ سے پوچھی تھی کی تتلی کے نوزائیدہ بچے کونسی غذا کھائیں گے۔ اے گھپاؤں میں سمٹی مادہ ...... ! تمہارے خیال میں یہ غذا کیا ہو سکتی ہے......؟" شاہین کی آنکھوں میں شوخیاں مچل رہی تھیں۔

"اور لو...... بھلا شبنم اور پھولوں کی عطر کے بغیر اور کیا غذا ہو سکتی ہے......!"

"ارے نہیں...... اس سے بھی سادہ چیز ہے وہ! ایسی چیز جس کا تم آسانی سے اہتمام کر سکتی ہو......!"

"اے آسمانی گیت گانے والے پرندے! تمہیں مذاق سوجھا ہے۔ بھلا میری حقیر ذات کرم کلے کے پتوں کے بغیر اور کیا پیش کر سکتی ہے......!"

"واہ...... تم نے تو نہایت آسانی سے اُس چیز کا نام لیا۔ سچ مچ یہی پتے ان بچوں کا من بھاتا کھانا ہے......!"

"نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا......" کرم پیلے کے سبز وجود میں ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اس نے پہلی بار طیش میں آکر کہا...... "تتلی نے آکری ہچکی لینے سے قبل اسی بات کی تلقین کی تھی کہ میں ان بچوں کو ایسی اناپ شناپ چیزیں نہ کھلاؤں......!"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ بے چاری تتلی کو ان چیزوں کی پیش بینی حاصل نہیں تھی۔ لیکن مجھے بار بار دوہرانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم جیسے لوگ پہلے سچا مشورہ سننے کو مضطرب رہتے ہیں اور پھر سچی بات سُننے کی تاب نہیں رکھتے......!"

"نہیں میرے غم خوار پرندے...... میں تمہاری ہر بات پہ یقین کر لیتی ہوں......!"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اے ریشم کے کیڑے کی مادہ......! تم تو میری اتنی سی بات پر اعتبار نہیں کر سکیں۔ میں تو تم سے کچھ اور ہی اہم باتیں کہنے آیا تھا۔ اب کیا کروں......؟ مجھے تو تمہاری حالت پہ ترس آتا ہے۔ اچھا چلو یہ بتادو کہ تتلی کے ان انڈوں سے کیا نکلنے والا ہے......؟"

"اور سنو......" کرم پیلا کی مادہ نے اپنی مخنی تن کے درمیانی حصے کو بلند کرتے ہوئے

کہا۔ ''تتلیاں میاں۔ اور بھلا ان سے کیا نکلے گا۔!''

شاہین نے اپنی مخاطب کی سادہ لوحی پہ اپنے خوب صورت پر پھڑ پھڑائے...... ''میری بات تحمل سے سنو۔ ان انڈوں سے تتلیاں نہیں...... ریشم کے کیڑے نکلیں گے۔ بالکل تمہاری طرح کے رینگنے والے......!!''

یہ اہم انکشاف کرتے ہی شاہین نے ایک لمبی اُڑان بھری کیونکہ وہ اس بظاہر نا قابل یقین بات پر اپنی دیرینہ واقف کار سے بے معنی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اُدھر کرم پیلا کی مادہ حیران و پریشان رہ گئی...... ''افسوس۔ میں پرندوں کی دنیا میں اسے سب سے زیادہ دانش مند سمجھتی تھی لیکن یہ کیسی احمقانہ باتیں کر کے گیا ہے۔ کتنی عجب بات ہے کہ جو لوگ اتنے اونچا اُڑتے ہیں۔ اُن کے خیالات اتنے پست ہوتے ہیں......!''

سحر زدہ مادہ انڈوں کے گرد چکر لگاتی رہی۔ باہر پرندے سرِ شام سر چھپا رہے تھے۔ تب ہی البیلا شاہین اچانک پھر ظاہر ہوا۔ اُس کے بدن پر جیسے چاندی کا لباس تھا...... ''اے ریشمی کیڑے...... سب سے اہم بات میں تمہیں سنا نہیں پایا۔ پس جان لو کہ ایک دن تم خود...... تتلی بن جاؤ گی......!!!'' کرم پیلا کی مادہ اب ضبط نہ کر سکی...... ''بد بخت پرندے۔ تم پہ اللہ کی مار۔ تم نے مجھ ستم رسیدہ مخلوق کا مذاق اُڑایا ہے۔ تم احمق ہی نہیں ظالم بھی ہو۔ چلے جاؤ۔ اب مجھے تمہارے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''اے بھولی مادہ............! تم نے سرِ شام اپنے اعتقاد کے جگنو بجھا دیئے ہیں......! تمہاری شب ظلمت اب کیونکر کٹے گی؟ لیکن یاد رکھو میں سرابوں کا اسیر نہیں ہوں۔ میں تو افق کے پار کی سیماؤں میں جا کر عجیب و غریب چیزیں دیکھتا ہوں۔ لیکن میں اپنے اندر اعتماد کے آفتاب کو کبھی بجھنے نہیں دیتا...... رہی تمہاری بات تم چونکہ صرف رینگ سکتی ہو اور کرم کلے کے اس پتے سے باہر کی دنیا دیکھنے کی متحمل نہیں ہو لہٰذا تمہیں ہر نئی چیز انہونی اور نا قابلِ فہم لگتی ہے......!'' شاہین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم مجھے بیوقوف سمجھتے ہو...... کہاں میرا یہ لانبا نحیف سبز بدن اور ان گنت ٹانگیں اور کہاں تتلی کی رنگینیاں اور ان کے پر......!''

''اپنے خول میں سمٹی ہوئی سادہ لوح مادہ! نا سمجھ دراصل ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بعض

ایسی باتوں کا جواز تلاش کرنے کی ناممکن کوشش کرتے ہیں جو اُن کی فہم وفراست سے بالاتر ہوتی ہیں۔ اس جہانِ رنگ و بو میں تمہیں جو سوغات ملتی ہے اُسے بڑھ کر اپنے آنچل میں سمیٹ لو...... میں یہی کرتا ہوں، میرا یہ اعتقاد ہی میرا سرمایہ حیات ہے......!"

یہ کہتے ہوئے شاہین اپنے چمچماتے شہپروں کو پھڑ پھڑاتا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اُس کی نوائے شوق کے ترانے کرم پیلا کی مادہ کے کانوں میں دیر تک گونجتے رہے۔ پھر وہ اچانک چونک اٹھی۔ اُس نے حیرت زدہ ہوکر اردگرد نظریں دوڑائیں۔ ابھی ابھی جہاں تتلی کے انڈے رکھے تھے وہاں اب ریشم کے آٹھ دس کیڑے اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے۔ انہوں نے چوس چوس کر کرم کلے کے پھیلے ہوئے پتے میں سوراخ بھی کر دیا تھا......!

یہ منظر دیکھ کر کرم پیلا کی مادہ ششدر رہ گئی۔ پھر ساری بات اُس کی سمجھ میں آگئی۔ اُس کا دل ندامت اور شرمندگی سے شرابور ہوگیا۔ کاش وہ اپنے محسن پرندے سے اپنی معذرت کا اظہار کرسکتی......!

اُس رات نوزائیدہ بچوں کو کھلانے کے دوران وہ اُس گھڑی کے خواب سجاتی رہی۔ جب وہ خود تتلی کے حسین پنکھ لے کر فضاؤں میں اُڑتی پھرے گی......!

☆☆☆

اشوک پٹواری

ریس کورس کے گھوڑے

اور جب میری آنکھ کھلتی ہے تو خود کو ایک بہت بڑے ریس کورس میں پاتا ہوں۔ ریس کورس لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ میرے دائیں بائیں لوگوں کا ہجوم ہے۔ کوئی مجھے پیچھے دھکیل رہا ہے۔ میں یہ گہما گہمی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں اور اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں۔ ''میں یہاں کیوں آیا'' میرا ذہن کشمکش میں مبتلا ہو رہا ہے۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتا میں جیک پاٹ جیتنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں، صرف ریس دیکھنے آیا ہوں یا؟ تبھی میرے اندر چھپا 'میں' مسکرا پڑتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ 'کیا یہ سبھی لوگ جو یہاں موجود ہیں یہ جانتے ہیں کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میں اپنے ذہن کی منطق سے الجھنا نہیں چاہتا اس لیے خاموش رہتا ہوں۔

ریس کورس میں موجود سبھی لوگ مجھ سے بے نیاز اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ تھوڑی دیر میں ریس کورس کے ہارس ایک گوشے سے نمودار ہوتے ہیں۔ کالے سنہرے، بھونرے، سفید، مختلف رنگوں کے گھوڑے۔ ریس دوڑنے والے گھوڑے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اکہرے بدن کے جاکی۔ ان کے چہرے سپاٹ ہیں۔ جذبات و تاثرات سے عاری، بار بار ایک ہی سین کی ریہرسل دیکھ دیکھ کر بیزار ہوئے ڈائریکٹر کی طرح۔!

کیا صرف گھوڑے دوڑتے ہیں؟ میں اپنے ذہن سے ایک اور سوال پوچھتا ہوں۔ میں اپنی یادداشت پر زور دیتا ہوں اور مجھے کل کا واقعہ یاد آتا ہیں۔ اس کی عمر مشکل سے آٹھ برس کی تھی۔ شہر کے بارونق بازار کے ایک طرف کھڑا وہ ہر آتے جاتے راہ گیر سے بھیک مانگ رہا تھا۔

''صاحب دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔'' اس کے معصوم چہرے سے ٹپکتی ہوئی بھوک و افلاس کی داستان میرے ذہن پر ضربیں مارنے لگی۔ میں نے گھبرا کر نظریں پھیر لیں۔ اگلے لمحے جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ دوڑ رہا تھا۔ ریس کورس کے گھوڑے سے تیز!

اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی تھی جو شاید اس نے چرائی تھی۔ سامنے سے ایک ٹرک پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ ایک لمحہ...... اور لڑکا ٹرک کے نیچے کچلا گیا۔ خون سے لت پت ڈبل روٹی اب بھی اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ ایک دوڑ مکمل ہوئی۔ ایک کہانی ختم ہوئی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی ریس کورس میں ہنگامہ مچ گیا۔ ریس شروع ہوئی اور تماشہ بین مسرت سے اچھلنے لگے۔ ''پک اپ شیطان''، ''شاباش کالو''، اور ''تیز جوزف'' ہر طرف سے پک اپ اور شاباش کی آوازیں آنے لگی۔ میرے ساتھ کھڑی اینگلوانڈین عورت دوربین سے جھانکتی ہوئی زور زور سے چلا رہی ہے ''پک اَپ نیلو'' نیلوفر سچ مچ سب سے آگے ہیں۔ تبھی نمبر چھ اس کے قریب سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کئی لوگ ایک ساتھ چیخ پڑے ''شاباش جوزف'' وہ اینگلوانڈین عورت ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے لیکن دوسری ہی لمحے وہ پھر پکارتی ہے ''پک اپ جوزف''......! جوزف سب سے آگے ہے۔ اس لیے وہ عورت نیلو کو بھول گئی ہے۔ اس کی زبان پر نیلو کے بدلے جوزف کا نام ہے کیونکہ نیلو ریس میں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کا یہ ردِعمل دیکھ کر مجھے مینا کی یاد آتی ہے۔ مینا جو میری محبت تھی۔ میری محبوبہ! اسے پانے کے لئے میں نے بہت دوڑ لگائی۔ مفلسی، بے کاری اور بھوک سے دور جانے کے لیے بے تحاشہ بھاگ رہا تھا میں! لیکن ریس میں پیچھے رہ گیا۔ نیلو کی طرح!

ریس اب پایہ تکمیل پر پہنچ گئی ہے۔ لوگوں کی رگوں کا خون تیزی سے دوڑ کر اب آگ اُگل رہا ہے۔ تماشائی بار بار رومال سے پسینے پونچھ رہے ہیں اور اپنے اپنے گھوڑوں کو شاباشی دے رہے ہیں۔ جوزف ریس جیت گیا ہے۔ لیکن ایک مریل سا گھوڑا جو سب سے پیچھے ہے اب بھی پوری طاقت سے دوڑ رہا ہے۔ ریس ختم ہو چکی ہے، پر وہ مریل سا گھوڑا جاکی کے بوجھ تلے دبا ہوا ریس جیتنے کی تمنا لے کر اب بھی بے تحاشہ بھاگ رہا ہے۔ ایسا ہی ایک گھوڑا میں ہر روز دیکھتا ہوں۔ مریل سا......! دمہ کا مریض۔ بوڑھا دِینا ناتھ کلرک......! جو تیس سال سے کلرک ہے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا وہ دوڑ رہا ہے۔ اس کے گھر میں تین کنواری بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ وہ ان کی شادی کسی اچھے گھرانے میں کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے اس کے بیٹے بڑے بڑے افسر بنیں۔ اس لئے روپیوں کی ضرورت ہے۔ راشن کے لیے، جہیز کے لیے، بچوں کی فیس کے لئے۔ اور یہ سب

حاصل کرنے کے لئے وہ ریس کورس میں تیس برس سے برابر دوڑ رہا ہے۔ دن رات فائلوں میں الجھا رہتا ہے۔ جب وہ پوری قوت سے دوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی بوڑھی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ اس کی ریس وہی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک اور کہانی تکمیل تک پہنچ جاتی ہے! مگر دوڑ یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اس کی بیوی دوڑتی ہے اس کے بیٹے سرپٹ بھاگتے ہیں۔ بسوں میں! ٹراموں میں۔ پیدل دوڑتے ہیں۔ دفتروں کی اور۔ کارخانوں کی جانب۔ دکانوں کی سمت میں۔ جھوٹ اور بے ایمانی کے راستے پر۔ اس کی بیٹیاں بھی دوڑتی ہیں۔ پوری قوت سے بھاگتی ہیں!۔ اور دوڑتے دوڑتے مندر تک پہنچ جاتی ہیں!۔ مسجد یا گرجا گھر میں جا کر پناہ لیتی ہیں۔ یا چکلوں میں جا کر رکتی ہیں۔ مگر دوڑ پھر بھی ختم نہیں ہوتی!

جیک پاٹ کس نے جیتا مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں ریس کورس میں موجود سبھی لوگوں کو بغور دیکھتا ہوں اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب دوڑ رہے ہیں روٹی کی اور روپے کی اور۔ کہیں کوئی انسان نظر نہیں آتا۔ ہر طرف ریس کورس کے گھوڑوں سے ملتی جلتی شکل والے اشخاص دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ میں بھی ریس کورس کا گھوڑا ہوں اور بے تحاشہ دوڑ رہا ہوں۔

☆☆☆

شمس الدین شمیم

مکان نمبر ۰۷ ۳

فٹ پاتھ ہم سب کے انتظار میں ہیں..............!!

بڑے شہر کی ایک بڑی بڑی سی ترقی پزیر کالونی کے مکان نمبر ۰۷ ۳ کے سادہ لوح باسی ہر لمحے اس خدشے میں رہتے ہیں کہ فٹ پاتھ ہم سب کے انتظار میں ہے لیکن جن باسیوں کو اس بات کی کوئی فکر نہیں وہ ایک دوسرے کے خلاف ساشوں میں ''بڑے'' مصروف ہیں۔اس مکان کے ہر کمرے میں آپا دھاپی اور دھینگا مُشتی کا بازار گرم ہے کیونکہ اس مکان کی کمیٹی اور اسکے چوکیدار کو منتخب کرنے کا معاملہ اُلجھا ہوا ہے۔ پوری کالونی میں یہ مکان ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں سے دور دور تک شاداب کناروں، جھیلوں، جھرنوں اور قدرتی نظاروں پر اگر نگاہ ٹھہر جائے تو صدیوں ٹھہری رہے گی۔اس مکان کے لان میں گلابوں کی قدرتی طور سجی دھجی محرابیں اور بادام کے شگوفوں کی مالائیں دل کو لبھا دیتی ہیں جس کی وجہ سے کالونی کے مالدار باسی بھی اس میں ہمیشہ کے لئے رہنا چاہتے ہیں لیکن اس مکان کے قانون کے مطابق اس میں کالونی اور بڑے شہروں کے لوگ صرف کچھ دنوں کیلئے ٹھہر سکتے ہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں مگر دسویں برف باری کے بعد یہ قانون صرف کاغذی ہی رہ گیا اور اُس وقت سے کالونی کے باقی باسی بھی اس مکان میں چوری چھپے گھس کر رہنے لگے۔

میں بھی اس مکان کا ایک باسی ہوں لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اب اسکا باسی نہیں رہا ہوں کیونکہ اس مکان سے دن بہ دن میرے جانے پہچانے چہرے غائب ہو رہے ہیں اور میں کالونی میں آئے ہوئے انجان باسیوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتا ہوں۔اس بات کا زیادہ احساس مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہو جاتا ہے اور میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پرسوں جب میں یہی سوچتا ہوا اپنے کمرے سے باہر آیا تو میری ٹانگ توڑ دی گئی، لہو بہنے لگا، میں نے درد کا اظہار نہیں کیا کیونکہ درد محسوس کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میرے

ذہن کے کواڑ پر کوئی دستک دینے لگا ''ابے کیا سوچتا ہے مکان نیلام ہو رہا ہے، معلوم ہے ایسا تو تمہارے اپنے ہی ''محترم'' اشخاص کر رہے ہیں۔ تم اور تمہارے دوسرے سادہ لوح ساتھیوں نے آج تک جس جس موٹی توند والے خاص آدمی کو مکان کی چوکیداری سونپ دی اُس نے بس اپنے۔ لئے ہی سب کچھ کیا۔ یہ خاص آدمی چوکیداری کرنے کے لئے ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے بن چکے ہیں کالونی کے جتنے بھی لوگ مکان میں چوری چھپے آئے ہیں اُن کے گھسنے میں وقت وقت پر ان ہی موٹی توند والے آدمیوں کا ہاتھ رہا ہے۔ یہی لوگ اپنی جیبیں گرم کرنے میں مست ہیں اُنہیں کالونی کے ان باسیوں کو واپس نکالنے کا کوئی غم نہیں، دھت تیرے کی''۔

یہ آواز... ہاں یہ آواز میرے ذہن پر ہر لمحے دستک دیتی ہے میں پریشان ہو جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ مکان کو بنے ہوئے اتنے برس ہو چکے ہیں اور اس عرصے میں مکان کی چوکیداری ''چھ خاص'' آدمیوں کو سونپی گئی لیکن اُنہوں نے مکان کے قانون کی خلاف ورزی کیوں کی ؟ دوسرے لوگوں کو اس میں چوری چھپے گھسنے کیوں دیا، اُنہیں احساس کیوں نہیں ہوتا کہ وہ کن تاریکیوں میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔ شائد اُنہیں علم نہیں کہ وہ خود اپنی نئی نسل کو فٹ پاتھ پر سلانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ وہ آنے والی نسل کی پناہ گاہ کو اُن کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سستے داموں بیچ رہے ہیں''.... میں ایسی ہی خشک باتیں سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں اور بڑی تیزی سے مکان کے شراب خانے میں گھس کر وسکی کے دو پیگ حلق سے نیچے اُتار کر مکان کے غم میں آنسو بہاتا ہوں۔

مجھے یاد ہے۔ یاد کیوں نہ ہو۔ وہ تو سردیوں کے دن تھے، میں گرم کوٹ پہنے ہوئے مکان کے لان میں کھڑا تھا تو میں نے سنا کہ کالونی کے بڑے باسیوں نے ایک اور سازش کی ہے۔ انہوں نے مکان کی چوکیداری ایک ''با اثر'' آدمی کو پھر سے سونپ دی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا ہے اور وہ دیوانہ وار بادشاہوں کی طرح مکان کی بنیادوں کو ہلانے لگا ہے، وہ ہلاتا رہا اور میں نے ایک جھٹکا محسوس کیا اور پھر جب میں نے سنا کہ وہ مکان کے لان میں دو چار دکان ''پگڑی'' کھا کر کالونی کے باقی مکانوں کے باسیوں کو کرایہ پر دینے کی کوشش کر رہا ہے تو مجھے وہ گورے لوگ یاد آگئے جنہوں نے کالونی کے لان کی کچھ دکانیں عارضی طور پر کرایہ پر لے لی تھیں لیکن پھر ایک صدی تک قبضہ نہیں چھوڑا تھا اور ساری کالونی پر

راج کرنے لگے تھے لیکن...... یہ تو گورے نہیں ہیں، یہ تو اپنی کالونی کے باسی ہیں... ہاں اس مکان کے باسی نہیں... یہ پرائے ہیں...'' میں ابھی کچھ یہی خرافات سوچ رہا تھا کہ میرے ذہن کے کواڑ پر پھر سے دستک ہونے لگی۔

''ابے جا.... میں کب کہتا ہوں کہ کالونی کے باقی باسی پرائے ہیں، وہ بھی تو اپنے ہی ہیں لیکن کالونی کے قانون کے مطابق وہ اس مکان نمبر ۳۷۰ میں نہیں رہ سکتے ہیں، اور نہ ہی کوئی دکان کھول سکتے ہیں۔''

یہ سن کر میں کوئی جواب نہ دے سکا بلکہ چپ چاپ اپنے مکان کے لان میں گھومتا رہا۔ اس سے کچھ دن پہلے جب بہار کے پرتو پھیلنے لگے تھے اور بادام کے شگوفے اپنے حسن کے دفتر کھولنے لگے تھے تو اُس بااثر شخص نے مکان کے چوکیدار نے مکان کے ہر سادہ لوح کا رُوٹی اور کپڑے کا حق چھین لیا۔ اُس وقت میں نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ مجھے یاد ہے اُن دنوں، ایک اداس سی شام کو جب میں مکان کی چوتھی منزل کی سیڑھیوں سے اوپر جا رہا تھا تو ایک لاغر سی بڑھیا نے مجھے روک کر اپنی کمزور اور بجھی ہوئی آنکھوں سے ایک سوال پوچھا تھا ''اب کیا ہوگا بیٹے ؟...میرے بچوں کو اب ہر روز بھوکوں سونا پڑے گا۔ برف کے چھ مہینوں میں اس مکان میں بے کاری کا راج ہوتا ہے۔اس کے لان میں اُس کی چھت پر برف ہی برف ہوتی ہے، ہم مزدور لوگ بے کار ہو جاتے ہیں۔اسی لئے دانا پانی سستے داموں ملتا تھا لیکن میرے بیٹے ... یہ حق بھی اب ہم سے چھین لیا گیا۔ اب کیا ہوگا؟ تانبے کے سارے برتن پیٹ کی آگ بجھانے میں بک گئے۔''ضعیف بڑھیا کے وہ الفاظ میرے ذہن پر اُس دن اور آج بھی ہتھوڑے برسا رہے ہیں۔ مجھے اب مکان کے اصلی مزدور اور ہنر مندوں کے چہروں پر پیلے رنگ کا راج ہی راج دکھائی دے رہا ہے۔اس وقت میں چپ چاپ دیکھتا رہا، سہتا رہا لیکن میرے ذہن کے کواڑ پر دستک دینے والا مجھے گھڑی گھڑی پریشان کرتا رہا اور مجھے اس بات کا پورا احساس دلاتا رہا کہ موٹی توندوالے ''خاص'' آدمیوں کو یکے بعد دیگرے مکان کی چوکیداری سونپی گئی۔اور وہ مکان کی حفاظت کرنے کے بجائے اس کے قاعدہ قانون پر کلہاڑی مارتے رہے۔مارتے رہے اور آج کل بھی انہیں اپنے مکان کی کوئی فکر نہیں کوئی غم نہیں۔پچھلے مارچ کے آخری دنوں میں ایک صبح کو میں لان والے نل پر منہ دھو رہا تھا۔میں نے ایک بھائی صاحب سے

سنا کہ ساری کالونی میں قرعہ اندازی کے ذریعہ نئی انتظامیہ وجود میں آئی ہے۔ میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ ٹھیک اسی شام کو بااثر آدمی سے مکان نمبر ۳۷۰ کی چوکیداری چھین لی گئی اور ہم سے کہا گیا کہ مکان کے لئے نئے چوکیدار کو چنا جائیگا۔ اس بات کو گزرے ہوئے اب کوئی چار ماہ ہوئے ہیں اسی لئے مکان کے نئے چوکیدار کو چننے کے لئے میرے مکان کے باسی ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے بن چکے ہیں۔ مکان میں لان کے قریب نل کی گندی نالی سے کافی لہو بہہ چکا ہے لیکن بے سود کیونکہ کسی کو مکان کے قاعدے قانون کی کوئی فکر نہیں، پھر وہی پرانی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ وہی موٹی توند والے پھر چوکیدار بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جنہوں نے یکے بعد دیگرے اس مکان کے قاعدہ قانون پر کلہاڑی ماردی ہے اور اب پھر وہی معزز چوکیدار بننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں تاکہ مکان کا ناک نقشہ مٹ جائے اور اس کے خدوخال تباہ ہو جائیں۔ اس کا وجود فنا ہو جائے، مجھے اس بات کا غم ہے شاید یہی غم میرے اندر ناسور بن جائے گا۔ یہ سب کچھ ہو کر بھی مجھے اُمید کی کوئی کرن سی نظر آتی ہے اور میں گنگنانے لگتا ہوں۔ میرے ذہن پر دستک دینے والا بھی کسی حد تک مطمئن نظر آتا ہے اور میں خوشی کے ملے جلے گیت گانے لگتا ہوں کہ اب قرعہ اندازی ہونے والی ہے لیکن مکان کے باسی اب کوئی غلطی نہیں کرینگے۔

اور آج صبح... ہاں ہاں... آج صبح جب میں دھوپ کی پہلی کرن کے ساتھ نیند سے جاگ اُٹھا تو مکان نمبر ۳۷۰ میں قرعہ اندازی ہو چکی تھی لیکن سب حیران تھے کیونکہ قرعہ اندازی کی پرچیاں خالی کی خالی تھیں ان پر کسی ایک بھی نشان پر مہر نہیں لگائی تھی۔ میرے ساتھی باسیوں نے کسی کو بھی نہیں چُنا تھا بلکہ ہر طرف فلک شگاف آوازیں بلند ہو رہی تھی۔ مکان نمبر ۳۷۰ کے سارے باسی لان میں کود آئے تھے اور نعرے بلند ہو رہے تھے۔

"یہ سب چور ہیں، ہمیں اُن میں سے کسی کو نہیں چننا ہے، مکان نمبر ۳۷۰ کے حقوق بحال کرو، اس میں ناجائز طور داخل ہوئے افراد کو نکال دو، اس مکان کے حقوق بحال کرو پھر قرعہ اندازی ہوگی، ہمیں کسی پر بھروسہ نہیں، یہ سب چوکی دار چور ہیں، مکان نمبر ۳۷۰ کے حقوق بحال کرو پھر قرعہ اندازی ہوگی۔"

یہ فلک شفاگ نعرے سنتے ہوئے میں ایک چنار کے سائے میں بیٹھ کر لہک لہک کر خوشی کے ترانے گانے لگا اور میرے ذہن پر دستک دینے والا اجنبی نئے ساز ترتیب دینے لگا۔ ☆☆

راجہ نذر بونیاری

جُھنجھنا

خط اس پتے پر لکھیں ''ڈاک خانہ شہیدی چوک محلّہ دلپتیاں دکاندار مشتاق کشتواڑی کو ملے غلام رسول پردیسی کو بوقتِ نیک ملے۔''

خط کو دوبارہ پڑھنے کے بعد اس نے تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ لفافہ لعاب لگا کر بند کیا اور پھر اُس کے اوپر لکھا۔ ڈاک خانہ شادی پور...... محلّہ میر گاؤں برابری پورہ تحصیل سمن آباد ضلع کشمیر پہنچ کر رحمان میر عرف رمبہ کا کا ولد مرحوم سبحان میر کو بوقت نیک مشرف ہووے۔ پھر نیچے لکھا چٹھی کا جواب جلدی دیں...... پھر...... کچھ سوچ کر...... اس کے نیچے لکھا۔ میری طرف سے سب برادری والوں کو سلام۔ پھر...... کچھ سوچ کر لکھا۔ زونی ماسی اور ماسٹر گل لون کو بھی سلام کہنا...... اور ہاں میں بھول گیا تھا کہ...... اپنا خیال رکھنا...... پھر وہ لفافے کے کونے میں بچی ہوئی تھوڑی سی جگہ میں اس نے لکھا...... چلو چل لفافہ کبوتر کی چال...... اگر ہو گی محبت ملے گا جواب...... غلام رسول پردیسی''۔

اور پھر جا کر لفافے کو شہیدی چوک میں نصب ایک لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ وہاں سے ہٹنے سے پہلے غلام رسول نے لیٹر بکس کی طرف دیکھا اور بولا ...... اوہو...... ایک ضروری بات لکھنا بھول گیا۔ لعنت ہو میری یادداشت پر۔ خیر چھوڑو اب کیا ہوگا...... جب وہ وہاں سے چند قدم چلا تو جیب میں بیڑی نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو دو چیزیں بیڑی کے ساتھ باہر آگئیں۔ ایک ڈاک خانہ کا ٹکٹ جو وہ لفافے پر چسپاں کرنا بھول گیا تھا اور ایک سیاہ رنگ کے دھاگے میں بندھا ہوا تعویذ...... یہ تعویذ اس نے شمع کے لئے 50 روپے کے عوض تالاب کھٹیکاں میں ٹھہرے ایک بابا سے لیا تھا۔ جس نے تعویذ اسکے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا تھا...... ''ایک ماہ تک یہ تعویذ شریف کالے کپڑے میں سیاند و کر اپنی بیوی کے گلے میں پہنا دینا اور ہر ماہ کی پہلی جمعرات ایک کالی مرغی ذبح کر کے چاول میں پکا کر محلے کے بچوں کو کھلا تقسیم کرنا۔ ہر اتوار صبح دم ایک روٹی گائے کو کھلانا

ہوگی.....اور ہر چاند کی اٹھائیس تاریخ کو ایک مٹھی چینی چیونٹیوں اور دو مٹھیاں چاول کبوتروں کے آگے ڈالنا نہ بھولنا.....انشاء اللہ چودھویں کے چاند جیسا فرزند پیدا ہوگا اور.....'' پیر بابا نے اسے جو باتیں کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ان میں سے وہ کچھ باتیں ہی بھول ہی گیا اور پھر تعویذ بھی بھول گیا اور لفافے کے اوپر ٹکٹ لگانا ہی بھول گیا۔ وہ رک گیا۔ پھر جا کر لیٹر بکس کے تالے کو کھینچ کھانچ کر دیکھا اور دیر تک لیٹر بکس کے سامنے اس طرح کھڑا رہا جیسے وہ کوئی چور ہو اور لاکر کو توڑنے یا کھولنے کی ترکیب پر غور کر رہا ہو۔

ایک ہفتے کے بعد مشتاق کشتواڑی نے غلام رسول کو ڈانٹتے ہوئے اطلاع دی کہ ایک ''بے رنگ'' خط اس کے نام آیا تھا اور ڈاکیہ اُس سے دس روپے لے گیا ہے۔ ''ابے تجھے..... ''بے رنگ'' خط ڈالنے کی کیا سوجھی۔ کیا تمہیں خط کے لئے 5 روپے بھی نہ جڑے لاؤ دس روپے دیدو.......''

اور غلام رسول نے کشتواڑی سے خط لے کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا وہی خط تھا۔ دس روپے کا ایک نوٹ اس نے مشتاق کشتواڑی کی ہتھیلی پر رکھا اور ڈاک خانہ کی طرف چل دیا۔

وہ جب بھی پریشان ہوتا یا وہ کسی قسم کا ذہنی دباؤ محسوس کرتا تو جا کر نوگزیئے پیر کے آستانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا۔ یا جامع مسجد کے صحن میں لیٹ جاتا۔

سلیم کے ہاتھ میں پلاسٹک کا خوبصورت جھنجھنا تھا۔ وہ شمع کی گود میں بیٹھا کبھی اس جھنجھنے کو ہلاتا، کبھی منہ میں رکھتا اور کبھی ہمکتا' اُچھلتا' کھلکھلا کر ہنستا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ابو کی طرف دیکھ کر خوش ہوتا' دونوں غلام رسول اور شمع اپنے بیٹے کی بلائیں لیتے اور خوش ہوتے۔ بیٹے کا نام سلیم اُس نے خود رکھا تھا۔ وہ مغل بادشاہ سلیم کی شخصیت سے بہت متاثر تھا جو بہ یک وقت خوب صورت' بہادر اور انصاف پرور اور عالم ہونے کے علاوہ جمالیاتی حس رکھنے والا ایک شاعر بھی تھا۔ وہ یہ سب باتیں اپنے بیٹے کی شخصیت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ سلیم کا نام نقشہ اور خدوخال اس کے اندر ایک عظیم شخصیت کے آئینہ دار تھے اور غلام رسول کو پختہ یقین تھا کہ یہ بچہ نہ صرف اپنے باپ بلکہ پورے قوم' قبیلے اور علاقے کا نام روشن کرے گا۔ پیر سلطان شاہ چوکی والے نے بھی یہی کہا تھا اور پریڈ کی دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے یوگی نے 'س' سے اس کی راشی دیکھ کر کہا کہ لڑکے کا یوم ولادت اور صحیح وقت بتایا جائے تو وہ تفصیلاً اس کا ایک نوٹ بنا کر دے گا۔ جس میں اس کی تقدیر کا حال'

حال اور مستقبل، سماجی رتبہ، تعلیم، صحت اور ازدواجی زندگی کے بارے میں راشی کی روشنی میں حالات کی تفصیل ہوگی۔

گھمٹ کی سیڑھیوں پر رکھے گئے گنگا طوطے نے کئی مرتبہ اپنی سرخ چونچ سے نیلا لفافہ نکالا جس پر لکھا تھا' سندر بالک ہوگا......ہونہار برواکے چکنے چکنے پات۔ پتا کا ہاتھ بٹائے گا' راج کرے گا' سندر چھوکری سے بیاہ ہوگا۔ گھر میں لکشمی آئیگی ۔ بد بش یاترا کرے گا......لمبی عمر پائے گا......وغیرہ وغیرہ۔ غلام رسول ہر تیسرے چوتھے دن چاول کی ایک مٹھی اور بیر اور امرود لاکر گنگا کے آگے رکھ دیتا۔ گنگا کا مالک رام لبھایا غلام رسول سے اب کوئی پیسہ نہ لیتا تھا......ایک زمانہ تھا جب غلام رسول اسے ایک آنہ دیتا تھا پھر نوبت آٹھ آنے پر آگئی اور اب رام لبھایا 5 روپے سے کم کسی کو نہ لیتا تھا......گزشتہ 20 سالوں میں رام لبھایا کے تین طوطے مر گئے تھے وہ ہر طوطے کا نام گنگا رکھتا تھا خواہ اس کا جنس کچھ بھی ہو۔ موجودہ گنگا کو اس کے پنجرے میں آئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے اور تین بار بیمار ہوا اور مرتے مرتے بچا۔ نیلا لفافہ یہ ہرا طوطا کئی مرتبہ نکال چکا تھا۔ جس کو دیکھ کر غلام رسول کو گنگا کی ایمانداری کا یقین ہو گیا تھا۔

اُس نے اپنی بانہیں جوں ہی آگے کی طرف پھیلائیں سلیم جھٹ اس کی بانہوں میں آ گیا۔ غلام رسول نے اسے چھاتی سے لگایا۔ چمکارا......اور اسے لیکر باہر نکل گیا۔ اس دن ماسٹر گلہ لون کے بیٹے کی شادی تھی ۔ برات دُلہن لیکر واپس آ رہی تھی ۔ رحمان بھانڈ شہنائی پر ایک خوبصورت گانے کی دھن بجا رہا تھا" یار تھو گلاس کلنی تل" اتنے میں کسی شریر بچے نے پٹاخہ جلا دیا" ٹھا" کی آواز سے غلام رسول کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سب کچھ وہیں تھا۔ صرف نہ کہیں وہ جھنجھنے والا بچہ تھا اور نہ اس کی ماں' وہ جا چکے تھے۔ غلام رسول نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور سلیم کی صورت کو تصور میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ پھر بھی ایک ایسے بچے کے لئے اس کے دل میں ممتا اور شفقت جاگ چکی تھی جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لئے ۔ پیر صاحب دعا کیجئے ......درگاہ کے پیر صاحب نے رسمی قسم کی دعا مانگی اور پھر غلام رسول سے مخاطب ہوا۔ ٹھیکے دار صاحب آپ کی طبیعت ٹھیک ہی ہے نا؟ آج آپ کے چہرے پر کچھ پریشانی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ خیر ہی تو ہے؟" "جی ہاں پیر صاحب۔ آپ کو میں نے بتایا تھا نا کہ اللہ

نے اس درگاہ کی وساطت سے مجھے پر ایک ایسی مہربانی کی ہے اور میری دیرینہ منت پوری ہونے والی ہے، میں باپ بننے والا ہوں۔ میری بیوی امید سے ہے، آٹھواں مہینہ ہے۔ یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ میرا سلیم آ رہا ہے"، "کون سلیم" پیر صاحب نے پوچھا "اوہ.....تو یہ بات ہے...... پیر صاحب مسکرانے لگے اور غلام رسول وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا......اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دو تین دن کے بعد گھر جانے کی تیاری شروع کر دیگا۔

اس نے اپنی کمائی کے روپے جمع کرنا شروع کر دیئے۔ اس کے بینک کھاتے میں اچھی خاصی رقم جمع تھی لیکن وہ پہلے لوگوں کے پاس رکھی ہوئی رقوم وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دو چار دن میں کالے خان گوجر سے 700، کنک منڈی کے گھنشیام سے 1000، لکھ داتا بازار کے مدن لعل سے 620، بس اڈہ کے مشتاق سے 2000 روپے اور گجر نگر کے حاجی محمد ایوب سے 6000 روپے وصول کر لئے اور اسی شام وہ پرانی منڈی پہنچ گیا۔ پہلے اس نے ماں کے لئے چینی مخمل خریدا پھر باپ کے لئے گرم دراز موزے اور زسپن 7 میٹر خریدا اور پھر شمع کے لئے "تم میرے ہوتے ہو کون" ساڑھے چار میٹر...... "راجہ ہندوستانی" 6 میٹر اور "رہا میرا دیور دیوانہ" 5 میٹر اور ایک تبتی شال خریدا۔ ماسٹر گلہ خان کے لئے اُسی کی فرمائش پر "تیرے نام" 6 میٹر خریدنے اور پھر کھلونے والی گلی کے "ہری سرن" سے ایک ٹائے گھوڑا...... ایک ٹائے سائیکل ......اور ربڑ کا ایک طوطا خریدا......اور یہ سب چیزیں اپنے کمرے میں رکھنے کے بعد اس نے عشاء کی نماز تالاب کھٹیکاں کی جامع مسجد میں ادا کی اور باہر صحن میں آ کر سنگ مرمر کے فرش پر منہ آسمان کی طرف کر کے لیٹ گیا۔ آسمان صاف تھا اور ان گنت تارے دور خلاء کی وسعتوں پر جھلملا رہے تھے۔ چاند پورا تھا اور پورے آب و تاب سے جلوہ گر تھا "میرا چاند......" اس چاند کی بدلی پر چمکے گا۔ میرا سلیم، میرا چاند......"

اگلے دن اُس نے جیول چوک کے درشن لال سے 800 اور کمپنی باغ کے جیالال سے 2000 روپے وصول کئے۔ بینک سے 20,000 روپے نکالے......اور دیرہ مارگ کی طرف چل دیا۔ گھمٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ایک کھلونے والے کی دکان پر آ کر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک جھنجھنا خریدا اور جا کر گنگا طوطے والے کے پاس بیٹھ گیا۔ سامنے کی دکان سے چار بار اسوٹ خریدنے کے بعد وہ پھر رام لبھایا کے پاس

آ کر بیٹھا۔ اس نے جیب سے حسب معمول ایک مٹھی امرود نکال کر گنگا کے سامنے رکھ دیئے اور رام لبھایا سے باتیں کرنے لگا۔ رام لبھایا نے دو بیڑیاں سلگائیں اور ایک غلام رسول کو دے کر پوچھا "گھر کب جاؤ گے سیٹھ؟" "ایک دو دن میں نکل جاؤں نگا...... بیوی کا نواں مہینہ چل رہا ہے، آخری ہفتہ ہے"۔

"پھر تو جانا ہی پڑے گا۔ اگر چھوکرا ہوا تو میرے گنگا کو انعام دینا......!"

اس سے پہلے کہ غلام رسول کچھ کہتا، اس کے گاؤں کا بشیر اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ علیک سلیک کے بعد وہ بولا "میں تین گھنٹے سے تمہاری تلاش میں تھا......مشتاق کشتواڑی نے کہا کہ تم جیول کی طرف گئے ہو۔ دیکھ آئے فلم؟"

"نہیں یار...... میں کام سے گیا تھا، تم گھر سے آئے کب اور مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے، خیریت ہی تو ہے......؟"

"وہی تو نہیں ......"، "میں! اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "کل ہی گاؤں سے آیا ہوں ......پچھلی اتوار کو شمع کو خدا نے ایک چاند سا بچہ دیا ہے" "کیا کہا؟" چاند سا بچہ، میرے خدا...... میرے سلیم کو......"

"ارے آگے تو سنو......!"

"کہو......جلد کہو...... آگے۔ میرا بچہ تو ٹھیک ہی ہے؟"

"ارے ہاں بچہ اور زچہ دونوں ٹھیک ہیں......لیکن......!"

"لیکن کیا......جلد کہو، میر کلیجہ پھٹ جائے گا!"

"وہ......بات ایسی ہے کہ گنتی میں ہیرا پھیری ہوگئی ہے۔ یہ میں نہیں کہتا، محلے بھر کی عورتیں باتیں کرتی تھیں۔"

"کیسی ہیرا پھیری......کیسی گنتی......ارے تم صاف کیوں نہیں کہتے......کہ بات کیا ہے؟"

"وہ......وہ......دراصل......تمہاری ماں نے......شمع بھابھی کو اس کے مائیکے بھیج دیا ہے!"

"کیوں......بشیرے کیوں......؟"

"محلے کی عورتوں نے چچی کو جا کر کہا کہ......گنتی......میں کچھ ہیرا پھیری ہے......!"

''کیسی ہیرا پھیری......ارے تم بولتے کیوں نہیں......!''

''وہ کہتی ہیں کہ بچہ تمہارے جموں جانے کے دس ماہ بعد پیدا......ہوا ہے۔ یہ وہ کہتی ہیں، میں نہیں''۔

غلام رسول آخری جملہ نہ سن سکا، صرف ''دس ماہ......دس ماہ......اور یہ الفاظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے شیشے کی طرح اترتے چلے گئے۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا......کانچ کا جھنجھنا اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکا تھا اور اس کے بیچ سے کانچ کے گول گول دانے لڑھک کر گنگا کے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

گھونسلہ

میں نے اپنا آفس چند روز پہلے ہی وادی سے باہر منتقل کیا تھا۔ وہاں حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ کام کرنا مشکل ہو گیا تھا اور پھر اس بارے میں اوپر سے بھی آرڈر آ چکا تھا۔ پریشانی صرف اتنی تھی کہ جائے تنگ است و مردماں بسیار۔ کم سے کم ایک تین منزلہ مکان کی ضرورت تھی ۔ تلاشِ بسیار کے بعد آخر کار ریلوے اسٹیشن کے متصل اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ کی بلڈنگ پر قناعت کرنی پڑی۔

پہلے دن دفتر کے سبھی ملازموں کو اکٹھا کیا۔ انہیں نازک حالات سے آگاہ کیا اور اپنے آپ کو بدلے ہوئے ماحول میں ڈھالنے کی ہدایت دی کیونکہ اب پہلے جیسی سہولتوں اور آسائشوں کی امید کرنا فضول تھا۔ غیر یقینی مستقبل کے سبب وہ پہلے ہی سے دل شکستہ تھے۔ اس لئے انہوں نے میری تجویز کسی اگر مگر کے بغیر مان لی اور پورے سمرپن، بلیدان اور لگن سے کام کرنے کا آشواسن دیا۔ وقت ضائع کئے بغیر ہم سب آفس کی تشکیل نو میں جٹ گئے۔

جہاں تک میرا سوال تھا، میں نے اپنے لئے ایک چھوٹا سا ہوا دار کمرہ، جس کی کھڑکیاں ریلوے پلیٹ فارم کی جانب کھلتی تھیں، مختص کیا۔ اس کمرے کی سجاوٹ میں نے اپنے ذمے لے لی۔

فرش پر ایک خوشنما قالین بچھوایا اور کھڑکیوں پر کریول ایمبر ایڈری کے رنگین پردے ڈلوا دیئے۔ دروازے کے عین مقابل ایک بڑا سا رائٹنگ ٹیبل اور اس کے پیچھے ایک ریوالونگ کرسی رکھوادی۔ اس پر بیٹھ کر دروازے کے باہر لوگوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رہ سکتی تھی۔ داہنی طرف، جہاں کھڑکیاں تھیں، وہاں میں نے چار کرسیاں رکھوا دیں جبکہ اس کے مقابل دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت صوفہ سیٹ رکھوا دیا۔ اس کے اوپر دیوار کی عین وسط میں راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا ڈیڑھ فٹ بائی دو فٹ فوٹو ایسے لٹکوا دیا کہ وہ دیوار کے ساتھ تیس درجے کا زاویہ بنانے لگا۔ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بھی مہمانوں کے لئے مزید دو کرسیاں رکھوا دیں۔

کمرے کی کھڑکیوں کے دو تین کانچ ٹوٹے ہوئے تھے۔ اکثر گرد آلود گرم ہوا ان سوراخوں سے گھس کر میرے چہرے پر ٹکورے لگاتی تھی۔ چنانچہ ابھی بہت سارے اہم کام پڑے ہوئے تھے اس لئے میں نے ان کو نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

کھڑکیوں کے باہر کا نظارہ بڑا ہی دلسوز تھا۔ پٹریوں کی پرلی طرف اوسر زمین کا بہت بڑا خطہ افق سے جاملتا تھا۔ اس بنجر زمین پر جگہ جگہ ببول اور ناگ پھنی کے پیڑ اُگے تھے جن کے سائے میں مریل گائیں اور جھلسی بھینسیں بیٹھ کر جگالی کیا کرتی تھیں۔ صبح تڑکے جھگی جھونپڑیوں کے غریب نادار بچے انہی پیڑیوں کے سائے تلے رفع حاجت کیلئے بیٹھ جاتے۔ بعض اوقات اِکا دُکا لاغر کتے کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں کو اپنے پنجوں سے یوں کریدتے جیسے ان میں کوئی قارون کا خزانہ چھپا ہو۔

پیش منظر بیتے ہوئے کل کے پس منظر سے بالکل الٹ تھا، وہاں پیر پنچال کی اُس طرف ہری بھری وادیاں تھیں، برف سے ڈھکے ہوئے نیلے اودے پہاڑ تھے، پرشکوہ چناروں کے سائے تھے، لہراتے بل کھاتے ہوئے جھرنے تھے، آئینہ صفت جھیلیں تھیں، سورج کی حرارت کو کم کرنے والی ٹھنڈی ہوائیں تھیں اور روح کو تازگی بخشنے والا چشمہ شاہی کا شفاف پانی تھا۔ اس کے برعکس یہاں تپتی پیاسی بنجر زمین تھی، بادلوں کے لئے ترستا آسمان تھا، اوپر دہکتا سورج تھا اور نیچے لُو کی آنچ میں جھلستی زندگی تھی۔ بالکل دوسری دنیا تھی۔

ایک روز میں یونہی اپنی کرسی پر بیٹھا خیالات میں غرق مسلسل کھڑکی کے باہر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک چھوٹی سی خاکستری رنگ کی چڑیا نیلے آکاش سے پری کی مانند اُتر آئی اور کھڑکی کی چوکھٹ پر اس جگہ بیٹھ گئی جہاں کانچ ٹوٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر دم لے کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اپنے پر جھاڑے اور پھُدک کر مہاتما گاندھی کے فوٹو پر جا بیٹھی۔ اس کی چونچ میں سوکھی گھاس کا ایک لمبا سا تنکا تھا جو اس نے نہایت عمدگی اور ہنر مندی سے فوٹو کے پیچھے جمع کر لیا۔ پھر بشاشت سے لوٹ کر کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد اس کا ہم صفیر اپنی منقار میں پھونس کا ٹکڑا لئے اُڑتا ہوا چلا آیا اور آہنی چوکھٹ پر چڑیا کی بغل میں بیٹھ گیا۔ چڑے نے پیار بھری نظروں سے اپنی محبوبہ کو دیکھ لیا۔ پھر اُسی کی تقلید میں پھونس کے ٹکڑے کو فوٹو کی عقب میں جمع کر لیا اور لوٹ کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں آنکھوں میں دونوں ایک دوسرے کی ستائش کرتے رہے، نہارتے

رہے اور چند ہی لمحوں کے بعد پھر سے اُڑ کر نیلے گگن کی وسعتوں میں کھو گئے۔ وہ منظر دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ محبت کی ایک نظر زندگی کی ساری تھکان مٹا دیتی ہے اور اس کی جگہ تروتازگی عطا کرتی ہے۔ یہ دونوں پکھیرو پیار کا ایک چھوٹا سا مندر بنانے کے واسطے ابھی ابھی سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے آئے تھے مگر ایک دوسرے کے التفات کو دیکھ کر دوبارہ لمبی پرواز کے لئے چل پڑے۔

جبلی طور پر ان پرندوں نے آنے والی برسات کی آہٹ سُنی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اب تھوڑے ہی دنوں میں رِم جھم مینہہ برسنے والا ہے اور ساری فضا پریم رس میں ڈوب جائے گی۔ اس لئے وہ پہلے ہی سے اپنے لئے ایک ایسا نشیمن بنانے میں جٹ گئے جس میں وہ پورے موسم ساتھ نبھاتے، خوراک بٹورتے، دانہ بدلی کرتے اور پھر افزائش نسل کا سامان کرتے۔ مادہ کنجشک انڈے دیتی اور ان کو تب تک سیتی جب تک ان میں سے چھوٹے چھوٹے چینچلے اپنے نازک اور ملائم سر ابھارتے۔ اس درمیان نر کنجشک نہ صرف اس نشیمن کی جی جان سے رکھوالی کرتا بلکہ اپنی مادہ ہم سفر کے لئے کھانے پینے کا انتظام بھی کرتا۔ پھر دونوں مل کر ان چوزوں کی پرورش کی خاطر صحراؤں اور بیابانوں کی اڑان بھرتے، ان کے لئے چوگا لے آتے اور اُن کو پیار سے کھلاتے۔ پھر ایک دن ایسا بھی آتا کہ ان چینچلوں کے پَر نکل آتے، وہ انہیں پھڑ پھڑانے کی کوشش کرتے اور قوت کا احساس ہوتے ہی فرصت میں اڑ جاتے۔ یہی ان دونوں کی زندگی کی تکمیل ہوتی اور ان کے خوابوں کی تعبیر بھی۔

دونوں نر اور مادہ میرے کمرے میں برابر آتے جاتے رہے اور اپنی چونچوں میں دبائی ہوئی گھاس پھونس، سوکھی پتیاں، روئی کے گالے اور دیگر پرندوں کے ادھڑے ہوئے زیریں ملائم پر اپنے گھونسلے میں کمالِ صناعی کے ساتھ جوڑتے رہے۔ انہیں میرے وجود سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرا ہونا یا نہ ہونا ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھا انہیں پہروں دیکھا کرتا اور ان کے صبر اور کاریگری کی داد دیتا۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جانوروں کے لئے گھر بنانا ایسا ہی جبلی فعل ہے جیسے سانس لینا، پانی پینا دانہ کھانا۔

اس واقعے کے بعد میں ہر روز ان دو ننھے منے کاریگروں کو تنکا تنکا جوڑ کر اپنا نشیمن بناتے دیکھا کرتا۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی منقاروں میں دور دور سے پوآل کے تنکے اور سوکھی چھال کے مہین ٹکڑے لے کر آتے اور جلاہوں کی مانند اپنے گھونسلے کے

تانے بانے بُنتے۔اس کارروائی کے لئے ان کے پاس ایک ہی آلہ تھا اور وہ تھا اُن کی چونچ۔ گھونسلہ بناتے وقت ان چھوٹی سی جانوں میں غضب کا اعتماد اور دور بینی نظر آتی تھی۔وہ اکثر کھڑکی کی آہنی سلاخوں پر بیٹھ کر اپنے آشیانے کو امید بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔ نشیمن کے تصور ہی سے ان کا دل باغ باغ ہو جاتا اور وہ اپنی بھوک اور تھکاوٹ کو بھلا کر دوبارہ تعمیر کے کام میں منہمک ہو جاتے۔ان کی پرواز کی تیز رفتاری ہی سے ان کی انبساط کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ان کی لگن اور استقامت کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نہ صرف انسان بلکہ چرند و پرند بھی ایک خوبصورت آشیانے کے خواب بُنتے ہیں اور اس کی تکمیل کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔

دونوں جُلاہے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ گھونسلے کے تار و پود بُنتے رہے۔انہوں نے سوکھی گھاس کے تنکوں کے ساتھ نرم روئی، حیوانوں کے بال اور جانوروں کے ملائم زیریں پَر اس طرح جڑ دیئے کہ گھونسلے کی اندرونی سطح گدگدی سی بن گئی۔اب وہ اس گھونسلے میں رہنے بھی لگے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی مزید تعمیر و تزئین بھی کرتے رہے۔کئی بار جب چڑا اور چڑیا اپنے نشیمن کی تعمیر کی خاطر نیلے آکاش کی وسعتوں میں اڑان بھرتے میری نگاہیں ان کا تعاقب کرتیں۔ وہ میلوں اڑتے، درختوں کی پھننگوں پر بیٹھتے، بجلی کی تاروں پر جھولتے یا پھر مکانوں کی چھتوں پر اترتے لیکن جہاں بھی جاتے ان کی نگاہیں ہمیشہ پوآل یا چوگے کی تلاش میں رہتیں۔

بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ان کی موجودگی کا عادی ہو گیا اور اب اُن کو نظر انداز کرنے لگا۔

قدرت نے جلدی ہی ان کی عبادت قبول کر لی۔آسمان پر کالی بدلیاں چھانے لگیں اور ساتھ ہی ساون کی جھڑی بھی لگ گئی۔ اُدھر جھینگر شور مچانے لگے، اِدھر مینڈک ٹرٹرانے لگے۔دور آم کے جھنڈ میں پپیہے پی پی کی رٹ لگانے لگے۔باغوں میں ساون کے جھولے پڑنے لگے اور فضا میں برہ کے گیت گونجنے لگے۔ چڑے اور چڑیا کے دل بھی عشق کی گرمی سے لبریز ہو گئے۔ چڑیا جہاں بھی جاتی، مجنوں چڑا چشم زدن میں وہاں جا کر اس کی بغل میں بیٹھ جاتا۔ چڑا اپنی پھندیت سے چڑیا کو اپنے دام میں پھنسالیتا۔دونوں ایک دوسرے کی جانب مقناطیسی قوت سے کھنچے چلے آتے۔چونچ سے چونچ لڑاتے۔ چڑا اپنے پنکھ پھلا

کراپنی مردانگی کا رعب جماتا اور دیکھتے ہی دیکھتے چڑیا کو زیر کر لیتا۔ پھر دونوں جوشِ مستی سے سرشار ہو کر دور خلاؤں میں پرواز کرتے۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے ہفتے بھر کی چھٹی لینی پڑی۔ سنیچر اور اتوار الگ۔ پورے نو دن میرا کمرہ بند رہا۔ اس دوران میں ان پیاسی روحوں کو بے روک ٹوک اور کھلم کھلا پیار کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ وہ میری عدم موجودگی کا جتنا بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے، اٹھالیا۔ ٹوٹے ہوئے کانچ کی بدولت انہیں کمرے میں بے خطر آنے جانے کی اور اپنے نشیمن تک رسائی کی پوری آزادی تھی۔ ان کی نقل و حرکت پر کسی آدم زاد کی نگرانی نہ تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ کمرے کا مکیں ہمیشہ کے لئے کمرے کو خیر باد کہہ کر کہیں اور چلا گیا۔ وہ جہاں مرضی بیٹھ جاتے اور جدھر مرضی گتھم گتھا ہو جاتے، سیلنگ فین کے بلیڈوں پر، رائٹنگ ٹیبل کے ٹاپ پر، کرسیوں کے بازوؤں پر یا پھر صوفے کے بیک پر۔ انہوں نے اپنی بیٹ سے قالین، صوفے اور فرنیچر سبھی پر جا بجا گلکاریاں کیں۔ پورے فرش پر خس و خاشاک پھیلا دیا اور نو دنوں میں ہی کمرہ سڑے ہوئے چرکین سے متعفن ہو گیا۔

جس دن چھٹی ختم ہوئی میں معمول سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی دفتر پہنچ گیا۔ دفتر میں چوکیدار اور صفائی کرمچاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے چوکیدار کو بلا کر اپنا کمرہ کھلوایا۔ دروازہ کھولتے ہی تیز بدبو نے میرا استقبال کیا۔ دائیں بائیں نظر ڈالی تو ہر جگہ کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ بہر حال اس کو تو میں صاف کروا ہی لیتا مگر قالین اور صوفے کی دُرگت دیکھ کر دل خستہ ہو گیا۔ پیخال کے داغ نکلنا ناممکن تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس منظر کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ رفتہ رفتہ میرا پارہ بڑھتا گیا اور مجھے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں صفائی کرمچاری پر برس پڑا جیسے یہ سارا قصور اسی کا تھا۔

"دیکھو کیا حالت بنائی ہے کمرے کی۔ تم ان دنوں کمرے کی صفائی نہیں کرتے تھے کیا؟"

"سر کمرہ تو بند رہتا تھا۔ آفس سپرانٹنڈنٹ کے پاس چابی نہیں تھی۔ پھر میں اس کی صفائی کیسے کر سکتا تھا؟"

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تاہم تحکمانہ لہجے میں دوبارہ بول اٹھا:

"دیکھو، سارے کمرے کی صفائی جلدی سے کر لو اور اس فوٹو کے پیچھے بنے ہوئے گھونسلے کو باہر پھینک دو۔ او کے!"، حکم دینے کے فوراً بعد میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد صفائی کرمچاری میرے پاس آیا اور عاجزی سے کہنے لگا:

''سر، میں اُس گھونسلے کو نہیں پھینک سکتا۔ اس میں چڑیا کے انڈے ہیں۔ وہ ٹوٹ جائیں گے۔ مجھے پاپ لگ جائے گا۔''

اس کا ضمیر اسے کسی ذی روح کا گھر اجاڑنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا جو اس کی صورت اور طرز گفتار سے صاف ظاہر تھا وہ کسی بھی صورت میں ایسا جوکھم اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔

صفائی کرمچاری کی نافرمانی کے سبب میرا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔

''تم اور تمہارا ابلڈی کانشنس! گھر میں انڈے نہیں کھاتے ہو۔ اُس وقت پاپ نہیں لگتا۔'' میں زور زور سے چلانے لگا۔ پھر خود ہی بڑھ کر فوٹو کے عقب سے گھونسلا نکال لایا اور اس کو کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔

دیکھتے دیکھتے اس نشیمن کا تنکا تنکا بکھر گیا۔ سارے انڈے زمین پر گرتے ہی ٹوٹ گئے اور ان میں سے رقیق مادہ سرعت کے ساتھ بہہ کر سوکھی دھرتی میں جذب ہو گیا۔

چوکیدار اور صفائی کرمچاری دم بخود اس کارروائی کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد میں نے صفائی کرمچاری کو دوبارہ ہدایت دی:۔

''اب تو کوئی پرابلم نہیں ہے تم کو۔ اس چھوٹی سی بات کو تم نے اتنا بڑا مسئلہ بنایا۔ نَو کَم آن۔ اب سارے کمرے کی جلدی سے صفائی کرلو۔''

آخر کار کمرے کی صفائی ہوئی اور صفائی کرمچاری نے مجھے اطلاع دی۔ میں خوش ہو کر اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ چڑیا اپنے دل میں آرزوؤں کا سمندر سمیٹے اور چونچ میں چوگا دبائے گردوں سے اُتر آئی۔ وہ کھڑکی کی آہنی چوکھٹ پر اُسی جگہ بیٹھ گئی جہاں کانچ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں امید اور توقع سے چمک رہی تھیں۔ چوکھٹ سے پُھدک کر وہ سیدھے فوٹو فریم پر جا بیٹھی۔ فریم کا عقبی منظر دیکھ یکایک اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا گھونسلا کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہڑبڑاہٹ میں اس کی منقار سے اناج کا دانہ چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ تب بھی اس کو اپنی آنکھوں پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اڑی اور اڑتی رہی۔ کمرے میں چاروں طرف اپنے نشیمن کو تلاشتی رہی۔ بارہا وہ اسی فوٹو کی جانب لوٹ آتی اور اس پر منڈلاتی رہتی۔ شاید اُجڑے مسکن کا کہیں کوئی سراغ مل جائے۔

بڑی دیر کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس کا نشیمن مستقل طور پر اجڑ چکا ہے اور اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ کہیں بھی کوئی نشان باقی نہیں بچا ہے۔ وہ وحشت سے پاگل ہو گئی اور سارے کمرے میں بے تحاشہ اڑنے لگی۔ کئی بار وہ اس فوٹو کے پاس آ گئی جس فوٹو کے عقب میں اس نے اپنے خواب سجائے تھے۔ وہ اس فوٹو کے ساتھ اپنا سر پٹکتی رہی اور بارہا اس کے کانچ پر ٹھونگے مارتی رہی جیسے وہی اس کی تباہی کا ذمے دار ہو۔ اس کی چونچ سے عجیب قسم کی درد بھری چیخیں نکل رہی تھیں۔

اُڑتے اُڑتے وہ اچانک تیز رفتار برقی پنکھے سے ٹکرائی۔ اس کے داہنے پنکھ کو زبردست ضرب لگی۔ بے شمار پَر کٹ کر سارے فرش پر بکھر گئے۔ وہ خود بھی دور فرش پر جا گری اور چیں چیں کرتی ہوئی تڑپتی رہی۔ تاہم اس کی دونوں آنکھیں فوٹو کی جانب تک رہی تھیں۔ پھر دم بھر میں وہ سدا کے لئے خاموش ہو گئی۔

دریں اثنا چڑا افرط شوق سے مخمور اُڑتا ہوا چلا آیا اور حسب معمول کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر پُھدک کر فوٹو فریم پر بیٹھا۔ فوٹو کے پیچھے جو نظر ڈالی وہاں سکتے کا عالم تھا۔ اس کی ساری خوشیاں پل ہی میں کافور ہو گئیں۔ مڑ کر دیکھا تو اپنی ہمجولی پر نگاہ پڑی۔ اس کی حالت دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔ فوراً پھدک کر نیچے اترا اور چڑیا کے مردہ جسم پر یوں منڈلانے لگا گویا وہ اُس سے روٹھ گئی ہو اور چڑا اس کو منانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے کئی بولیاں بولیں، کئی سحر کاریاں آزمائیں لیکن چڑیا کو جاگنا تھا نہ وہ جاگی۔

چڑے کا دل بھر آیا۔ اس کے من میں ہوک سی اُٹھی۔ وہ بار بار اپنے اجڑے ہوئے نشیمن کی جانب نظریں اٹھاتا اور پھر مایوس ہو کر خود ہی جھکا لیتا۔ دل شکستہ ہو کر وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

اس کا آشیانہ دہشت کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی ہم نوا ہمیشہ کیلئے بچھڑ چکی تھی۔ اس کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔

چڑے نے آخری بار مڑ کر اپنے لٹے ہوئے نشیمن پر نظر ڈالی، بڑی کوشش کے بعد پھر سے ہمت مجتمع کی، اپنے پَر جھاڑے اور پھر دور نیلے آسمان میں نہ جانے کہاں کھو گیا۔

☆☆☆

دُعا

یہ ممکن نہیں ہے کہ غُلاں کی دعا قبول نہ ہو۔ بستی کا ہر شخص یہی کہتا ہے۔ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ سورج کی روشنی نہ آئے اور رات کالی کی جگہ سفید ہو جائے مگر یہ نہیں سوچ سکتے کہ غُلاں کی دُعا قبول نہ ہو۔

غُلاں کو اصل میں خدا کی بخشش ہے۔ رام دتہ نے ایک دن اعلانیہ کہہ دیا اور اس بات کی تصدیق کی کہ لوگوں کو پنڈت کی پرارتھنا اور مولوی کی دعا سے بھی زیادہ غُلاں کی دعا پر یقین ہے۔

غُلاں نہ کسی پیر کو مانتی ہے اور نہ کسی فقیر کو۔ بس وہ صرف اطمینان کرتی ہے کہ رات کو اس کے پڑوس میں کوئی بھوکا تو نہیں اور یہاں تک کہ گلی کے کتے کو بھی بھوکا نہیں رہنے دیتی۔ اُسے مندر کے پجاری اور مسجد کے مُلا کا بھی فکر رہتا ہے۔ غُلاں جانوروں کی زبان سمجھتی ہے اگر کوا بولے تو اچانک کہتی ہے کوئی پردیسی آنے والا ہے۔

غُلاں کا لڑکا رُگو ایک چھوٹی سی دوکان کرتا ہے چھوٹے چھوٹے گاہک اس کی دوکان پر آکر سامان خریدتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گاہکوں کی چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں رگو کی دوکان کی رونق ہیں۔

''کتنے پیسے بنے؟''

''چار روپے دس پیسے'' رُگو نے جواب دیا۔

''یہ لو چار روپے، دس پیسے کل دوں گا''۔

کہنے والوں کو بھی معلوم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور سننے والوں کو بھی پتہ ہے کہ پیسے نہ اس نے مانگنے ہیں اور نہ ہی انہوں نے دینے ہیں۔

پھر دوسرے گاہک کو رُگو نے کہا۔

''تیرے بیس پیسے بچے ہیں کل لے لینا۔''

وہ کل کبھی نہیں آتا۔ سب اس بات کو جانتے ہیں مگر یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ ایک دن شام کو ایک غریب مزدور پریشان تھا کیونکہ اس کا دل حلوہ کھانے پر آیا ہوا تھا۔

مگر پریشانی یہ تھی کہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے گھر والوں کو دال مرچی کے بغیر کھانی پڑتی مگر رُکو نے غلطی کی اور دال کی قیمت پچاس پیسے کم بتا گیا۔ اس غلطی کو غلاں نے دیکھا مگر نہ جانے کیوں چپ رہی۔

غلاں کے پڑوس میں باشی کا گھر ہے۔ باشی کے تین بیٹے ہیں۔ تینوں سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ کھانے پینے کا طریقہ بھی نرالا ہے مگر گھر کا سارا کام گھر کی بوڑھی یعنی باشی کی بیوی اور گھر کی مالکن شانتی کو کرنا پڑتا ہے۔

''ماں کے ہاتھوں کا کھانا اچھا لگتا ہے۔''

شانتی کے بڑے لڑکے کی یہ آواز ہے۔

''ماں کے بغیر گھر، گھر نہیں ہے اس لیے ماں کو ہمیشہ رسوئی میں رہنا چاہئے۔''

باشی کا دوسرا لڑکا یہ کہتا ہے۔

مجھے تو کھانا چاہئے۔ کوئی بھی بنائے۔

یہ تیسرے لڑکے کی آواز ہے۔ تینوں لڑکے چاہتے ہیں کہ ماں کو جو ہو سو ہو مگر ان کی بیویاں خوبصورت رہیں۔ ان کے چہروں پر دھبہ نہ لگے۔ ان کے مطابق ماں تو ایک گئی گزری چیز ہے ایک سنائی گئی کہانی ہے جسے دوہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کھانا شانتی تیار کرتی ہے کپڑے شانتی دھوتی ہے، صفائی شانتی کرتی ہے۔ سارا گھر شانتی کے گرد گھومتا ہے۔ کوئی مر جائے تو شانتی کو جانا پڑتا ہے۔ کوئی پیدا ہو تو شانتی کو جانا پڑتا ہے۔ لوگوں کی شادیوں پر بھاجی دینے کے لیے شانتی جاتی ہے۔ پھر کھانے پینے کے لیے بہویں اور بیٹے جاتے اور وہ تب جاتے ہے جب انہیں یقین آ جاتا ہے۔ لوگوں کو شانتی پیسے دے چکی ہے۔

شانتی ماں نہ ہوتی تو ضرور اسے گھر کی نوکرانی کہتے۔ اصل میں شانتی کی حالت نوکرانی جیسی ہی ہے مگر اس کے باوجود لوگ اسے ماں کہتے ہیں، گھر کی مالکن کہتے ہیں کیونکہ لوگوں کو معلوم ہے کہ شانتی نے تینوں بچوں کو جنم دیا پھر پالا پوسا بڑا کیا۔ ان کی شادیاں کیں، شگن منائے۔ تینوں بیٹوں کے پیار میں شانتی اتنی اندھی ہوگئی ہے کہ انہیں

کچھ نہیں کہتی۔ یہاں تک کہ بہوؤں کو بھی کچھ نہیں کہتی۔ ان کی عزت رکھنے کے لیے اتنا کہتی۔

''میں خود وقت گزارنے کے لیے کام کرتی ہوں۔ ورنہ بہوویں مجھے ایسا کہاں کرنے دیتی ہیں۔

اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں بہوویں ناراض تو نہیں ہیں۔

ادھر باشی رام تمام زندگی پیسے گنتا رہا۔ یوں لگا جیسے باشی رام جب پیدا ہوا تو رو کر پوچھ رہا ہو میرے روپے کہاں ہیں۔ شانتی گھر کا کام کرتی ہے اور پیسے بچتے ہیں، پیسے یعنی کہ نوکرانی کے پیسے مگر باشی رام کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ تو خوش تھا کہ شانتی جب اس کے گھر میں آئی تو بہت خوبصورت بھی تھی اور نازک بھی مگر یہ اس کے بعد معلوم ہوا کہ باشی کو روپیوں سے پیار تھا۔ وہ صرف روپے کمانا چاہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی شانتی کو کہتا جو چاہو لے لو میرا وقت ضائع مت کرو۔ اصل میں اب باشی رام کو روپیوں کی بالکل ضرورت نہ تھی مگر اب روپے کمائے بغیر باشی رام زندہ نہ رہ سکتا تھا۔

اگر وہ دو دن پیسے نہ کمائے تو بیمار ہو جاتا تھا مگر ایسی حالت میں شانتی اس کا علاج کسی ڈاکٹر سے نہ کراتی بلکہ اس کی جیب سے نکال کر پیسے اسے دے دیتی اور باشی رام ٹھیک ہو جاتا۔ شانتی کو کبھی کبھی لگتا تھا کہ اس بستی کے تمام لوگوں کو تھوڑی باشی رام کی طرح ضرور کوئی بیماری ہے باشی رام کو اگر اپنے ہی کھوئے ہوئے پیسے مل جائیں تو خوش ہو جاتا ہے اور روپیوں کو بار بار گننے میں اسے مزا آتا ہے۔ ان کے بارے میں سوچنے سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

ایک دن ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ شانتی بیمار ہوگئی۔ لگا کہ سارا گھر بیمار ہو گیا گھر کی ہر انیٹ بیمار لگنے لگی۔ محسوس ہونے لگا کہ ہر چیز کے ساتھ شانتی کا کوئی نہ کوئی تعلق ہو اور ہر شے جیسے ایک یا دوسرے طریقہ سے شانتی سے جوڑی ہوئی ہے۔ آخر ایک دن مجبور ہو کر بہوؤں کو گھر کا کام کرنا پڑا۔

جونہی شانتی کی بڑی بہو نے آگ جلانے کی کوشش کی تو وہ لپک گئی۔ گویا اسے کہہ رہی ہو مجھے مت چھو۔ چھوٹی بہو نے صفائی کرنے کی کوشش کی تو اس کا پاؤں پھسلا گویا زمین اس کے چلنے کے خلاف احتجاج کر رہی ہو۔

پھر تیسری بہو نے جب کپڑے دھونے کی کوشش کی تو ڈنڈا اپنے ہاتھ پر مار گئی۔ لگا

کہ جو لوگ کام سے نفرت کرتے ہیں ایک وقت آتا ہے کام بھی ان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔

شانتی کی بیماری اور بڑھ گئی گھر میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا چاروں طرف گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک دن باشی رام نے آ کر غلاں کو بلایا اور کہا کہ شانتی کے حق میں وہ دعا کرے تا کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔

غلاں نے کہا کہ وہ حسب معمول مہینے کے پہلی اتوار کو دعا کرے گی جس پر باشی رام نے کہا۔

''ہم تو مر جائے گے پہلی اتوار میں تو ابھی پورا مہینہ ہے۔''

اس پر غلاں نے کہا وہ دعا کرتی ہی مہینے کے پہلی اتوار کو ہے لہذا وہ اس سے پہلے ایسا نہیں کر سکتی۔ اس پر باشی رام اور پریشان ہوا۔ اس نے غلاں سے کہا۔

''اچھا اپنی بہو یعنی رگو کی بیوی کو تب ہمارے گھر کام کرنے دو۔ تین سو روپے دوں گا۔''

غلاں سن کر حیران ہو گئی۔ باشی رام اور تین سو روپے دے گا۔ باشی رام کے تین سو روپے تین لاکھ روپیوں کے برابر لگے۔ کیونکہ باشی رام کسی کو تین سو روپے دینے کو کہے یہ ناممکن تھا۔ غلاں کو باشی رام کی مجبوری کا پتہ لگ گیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ باشی رام کتنا مجبور ہے۔ غلاں نے ہاں کہہ دی۔ رگو کی بیوی مان گئی کیوں کہ گھر کا کام ویسے بھی غلاں کرتی ہے۔ پھر ان کے گھر کا کام تھا بھی کتنا جو غلاں پریشان ہوتی۔ صبح ناشتہ زیادہ بنا دو تو دو پہر کا کھانا بھی اسی میں نکل جاتا ہے۔ چائے کے ساتھ روٹی ملا کر کھاؤ تو ناشتہ ہو گیا۔ نہ کوئی ناشتے کی میز اور نہ کوئی کھانے کا کمرہ، نہ سونے کے کپڑے الگ اور نہ کھانے کے کپڑے الگ۔ نہ باہر جانا اور نہ تیار ہونا۔ جب کسی شادی میں جانا ہو، کپڑوں کو استری کرانا اور پہن لینا۔ کوئی کیا کھا رہا ہے اور کیا پہن رہا ہے ایسی کوئی پریشانی نہیں۔ لہذا رگو کی بیوی کے باشی رام کے گھر کام کرنے سے ان کے اپنے گھر میں زیادہ فرق نہیں پڑا۔ پورا مہینہ رگو کی بیوی باشی رام کے گھر کام کرتی رہی۔

گھر کے سارے سامان سے اس نے تعاون کیا۔ یوں لگا جیسے یہ سب کچھ اسی کا ہو اور اسی کے لیے بنا ہو۔ شانتی کو دوائی اور سیوا بھی وہی کرتی۔ مہینہ بیت گیا۔ پہلا اتوار بھی

آ گیا۔ باشی رام نے وعدے کے مطابق اسے تین سو روپے دئے۔ جب وہ تین سو روپے گن رہا تھا تو محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی گناہ کر رہا ہے۔ جسے کرنے سے اسے پچھتانا پڑے گا۔ پھر اس نے اس سے کہا، غلاں کو کہنا شام کو دعا کرانے آؤں گا۔ رگو کی بیوی چلی گئی۔ جب وہ گھر پہنچی تو سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

''میں اب ضرور پاس ہو جاؤں گی۔''

اس کی بڑی لڑکی نے ماں کے ہاتھ میں سے تیس روپے لیتے ہوئے کہا۔

''میری قمیض بن جائیگی''۔ بڑے لڑکے نے بیس روپے لیتے ہوئے کہا۔

''میں ضرور ان میں سے انہیں ایک پینٹ سلا دوں گی۔ زندگی گزر گئی مگر انہوں نے اچھے کپڑے پہنے ہی نہیں۔''

رگو کی بیوی نے کہا۔

''پھر ہم سینما دیکھنے جائیں گے۔''

ممی کی آمدنی بھی بڑھ گئی ہے اب میں ٹیوشن لگاؤں گی اور ڈاکٹر بنوں گی۔

''بس دعا کرو کہ شانتی ٹھیک نہ ہو اور ہمارا کام چلتا رہے۔

رگو کے بڑے لڑکے نے کہا۔ اتنی دیر میں رگو گھر آیا اور کہنے لگا۔

'' دنیا کے لئے دعا کرتی ہے پھر اپنے پوتوں کے لئے نہ کرے گی؟'' پوتے تو دادیوں کی جان ہوتے ہیں۔''

رگو کی بیوی نے کہا اور باشی رام یہ سب چپ چاپ سنتا رہا۔

☆☆☆

مشتاق مہدی

شکر بابا

پتہ نہیں.....کون تھا وہ کہاں سے آیا تھا.....؟ وہ کچھ دن سے اس شہر میں دکھائی دیا۔ کندھوں پر شکر کی بوری لئے.....کبھی شہر کے بڑے چوراہے پر نظر آتا.....تو کبھی کسی کم آباد اُچاٹ سی گلی میں اور کبھی اسی سڑک پر۔

موڑ میں ہوتا.....تو میٹھے سروں میں کبھی گا بھی لیتا۔

لے لو شکر.....میٹھا شکر، مفت شکر۔

شکر بابا ہے آیا تیرے شہر میں.....۔

وہ بلا لحاظ مذہب و رنگ لوگوں میں یہ شکر تقسیم کر رہا تھا۔۔ بغیر کسی معاوضے کے.....مگر لوگ.....لوگ اُس سے دور بھاگتے تھے، اسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ سیاست دانوں نے کہا: ''ہمارے دشمن کا جاسوس ہوگا.....اور کون ہوگا''۔

دانشوروں نے فتویٰ دیا: ''فریبی.....کوئی ڈھونگی ہوگا.....جال پھینکتا ہے، نہ معلوم کیا لوٹ کے جائے گا یہاں سے''۔

فلسفیوں نے اسے موضوعِ بحث بنایا: ''آخر وہ کیوں یہ شکر مفت تقسیم کر رہا ہے''؟

بڑے بزرگوں نے کہا: ''نہ ایسا سنا ہے، نہ ایسا دیکھا ہے کبھی.....کون کسے مفت دیگا۔ ضرور کوئی جعلساز ہوگا''۔

جواں حسیناؤں نے آپس میں کہا: ''شکر و کر تو ایک بہانہ ہے۔ وہ ہمیں پھسلانے کیلئے دانہ پھینک رہا ہے''۔

اور ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سمجھا دیا.....بلکہ ڈرایا.....سنا تم نے.....اسکے پاس ہرگز نہ جانا.....وہ بوری میں بھر کے تمہیں لے جائے گا.....؟''

''ماں کہاں لیجائے گا؟

''وہیں.....جہاں سے وہ آیا ہے''۔

''ماں......وہ کہاں سے آیا ہے......''

''کیا پتہ......کہاں سے آیا ہے......تم نے یاد رکھا......ہرگز بھی اس کے قریب نہ جانا۔''

بچے......آخر بچے تھے۔ڈر سے گئے۔اور گھروں کے نیم تاریک کونوں میں چھپ گئے۔شکر بابا اپنی ہی دھن میں مست رہنے والا آدمی تھا۔لوگوں کی باتوں کی کم ہی پرواہ کرتا تھا......وہ تو بس اپنا کام پورا کر رہا تھا۔دن بھر شکر کی بوری کاندھوں پر اٹھائے کبھی اس گلی میں نظر آتا......تو کبھی اس موڑ پر اور کبھی کسی باغ میدان میں......شام کو اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کرتا......کہ جس کے مقدر میں جو دانا لکھا تھا اسے وہ دے آیا ہے۔وقت اور موسم ایک سا نہیں رہتا۔موسم بدل گیا تھا......اور بدلتے موسم کے ساتھ ہی لوگوں کے سوچنے کے انداز میں بھی تبدیلی سی آ گئی۔

سیاست کاروں نے ایک زبان ہو کر کہا: ''شکر بابا......انسانیت کا دوست ہے۔محبت کا علمبردار ہے''۔

دانشوروں نے اپنی رائے بدل ڈالی تھی ''......ایک نیک روح۔۔ایک مہان انسان ......ایک درویش''۔

بزرگوں نے اپنی آواز ملائی: ''ماضی میں بھی بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں۔جو نام کما گئے ہیں، جو سخی تھے......سب کو کچھ نہ کچھ دیتے تھے اور کسی سے کچھ نہ لیتے تھے''۔

جوان حسیناؤں اور عورتوں نے ایک ہی زبان میں کہا: ''ایک مہربان جوگی......نہ معلوم کس جوگن کا خواب''۔

اور بچے جو پہلے ڈرتے تھے......دور بھاگتے تھے اس سے......اب اس کے قریب ہی ہنستے مسکراتے اپنے لڑکپن کے کھیل (کاٹ شاہی بم......بم شاہی کاٹ) کھیلتے ہوئے نظر آتے......شکر بابا ان کے ساتھ گھل مل جاتا تھا۔

پر ایک دن ایسا ہوا......جونہی وہ نیند سے بیدار ہوا۔اسکی نگاہیں بوری سے جا ٹکرائیں ......بوری قریب قریب خالی ہو چکی تھی......وقت بہت آگے جا چکا تھا......تو......تو کیا یہ شہر چھوڑنے کا وقت آ گیا۔۔وہ اداس سا ہو گیا۔۔مزید کچھ سوچے بغیر بستر سے اُٹھ گیا۔منہ ہاتھ دھویا۔شہر کے بڑے چوراہے کی طرف!

جب وہ شکر کا آخری دانہ تقسیم کر چکا، تو اسکے چہرے پر مسرت اور اطمینان سا جھلکنے لگا۔ اس نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ شہر اسے خوبصورت لگا، اپنا سا لگا، پیارہ سا لگا۔ اس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کیں ...... جیسے شہر کا سارا حسن اپنی نگاہوں میں قید کر کے جانا چاہتا ہو...... اس نے آنکھیں کھولیں ...... اب اس کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس نے خالی بوری بغل میں چھپائی ...... اور شہر کے بڑے چوراہے کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ نکل پڑا۔

کچھ ہی دور جانے کے بعد اسے خیال آیا۔ لوگ کہاں گئے ہیں ...... شہر کے سارے مرد، عورتیں بچے ...... عموماً جو بھیڑ بھاڑ میں اسکے ارد گرد ہوتی تھی ...... آج وہ اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ حیران سا رہ گیا ...... مجبور انسان ...... کسی کام میں مشغول ہونگے، اس نے خود کو تسلی دی ...... لیکن خود کے ایک حصے نے سوال کیا۔

دانشوروں اور سیاستدانوں کی آنکھوں میں کیوں آج پہلی سی اجنبیت جھلکتی ہے؟ ماؤں نے کیوں اپنے بچوں کو مکانوں کے اندر چھپا دیا ہے؟ عورتیں کیوں آج بدلی بدلی، بیزار سے نظر آتی ہیں؟ یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہے آج اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ...... اس کے قدم بھاری ہو گئے ...... وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ چلنے لگا ...... اسے لگا، وہ اس شہر میں اکیلا ہے۔ یہاں اس کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ پہلے اسے شک تھا۔ لیکن شہر والوں کی بے حسی اور بے رخی دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ ریت ...... ریت ہی ہے! وہ دور دور تک پھیلے ہوئے مکان، سڑکیں، کاریں اور لوگوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر چیخ اٹھا۔ ریت کا شہر ...... ریت کے مکان ...... ریت کے انسان ...... ریت کا کاروبار ...... چاروں طرف بس ریت ہی ریت!

شہر والوں کی بے رخی نے اسے ایک گہرا زخم دیا تھا۔ وہ اب جلد سے جلد یہ شہر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کے قدم اِدھر اُدھر لڑکھڑا رہے تھے ...... خشک ہونٹوں پر بار بار تری کرنے سے اس کی زبان سوکھ گئی تھی ...... اور آنکھوں میں ویران اندھیرے سے چھا گئے تھے۔ بالآخر جب وہ شہر کے آخری موڑ کے نزدیک پہنچا، تو دور سے آتی ہوئی ایک آواز کانوں سے ٹکرائی ......۔

"شکر بابا، ٹھہرو.. ہمیں مفت شکر دینے والا بابا ٹھہرو ......"

اس نے مڑ کے دیکھا...... بڑے شہر کا ایک چھوٹا سا کوچہ پیار سے آواز دے رہا تھا۔
اسکی جانب بڑھ رہا تھا...... محض چند لوگ...... کچھ بچے...... دو تین عورتیں۔
وہ اندر ہی اندر شرمسار ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسوں کا ریلا روک کر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولا: ''سچ اب بھی یہاں موجود ہے۔ یہ نہ ہوتا......تو یہ کتابِ سفر اسی موڑ پر ٹھہر جاتی، جہاں پر کہ اس نے اپنے قدم سنبھالے ہیں''۔

☆☆☆

مداوا

فجر کی اذان مکمل ہوتے ہی، جمیلہ نے کروٹ بدلی، جیسے وہ اذان کے ختم ہونے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ چند لمحے وہ اس طرح بے حس وحرکت پڑی رہی۔ آنکھیں بند کرنا چاہی لیکن ایسا کرتے ہوئے اسے خوف سا محسوس ہوا۔ دھیمی روشنی میں کمرے کی ہر شئے اسے دور بھاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ خاوند محمد افضل وضو کے لئے کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح خالی خالی نظروں سے کمرے کو دیکھتی رہی جس کے دوران اس پر عجیب ڈرامائی سی کیفیت طاری ہوئی۔ اسے اپنا آپ اندر سے کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا، گبھراہٹ اور خوف میں اس نے خاوند کو بلانے کے لئے پوری قوت سے پکارنا چاہا۔ منہ کھولا، مگر اسکی پکار ایک دردناک چیخ میں بدل گئی۔ جس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود ہر شئے جیسے چیخنے لگی۔ اس نے عجیب انداز میں ایک تکیہ اٹھا کر سینے پر زور سے بھینچ لیا اور پاگلوں کی طرح، جاوید...... جاوید...... میرے لعل...... میرے جگر...... مجھے بھی اپنے پاس بلالو، کہتے کہتے کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگی۔ اسی دوران محمد افضل وضو سے فارغ ہو کر غسل خانے سے باہر نکلا۔ بیوی کی چیخیں سن کر وہ تذبذب اور پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد چیخیں سسکیوں میں تبدیل ہوگئی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پار ہا تھا کہ مسجد کا رخ کرے یا کمرے کا...... پانچ دن پہلے ان کا اکلوتا بیٹا کمپیوٹر سنٹر سے واپس گھر آتے ہوئے مین روڑ پر ایک زبردست مائین بلاسٹ میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔ یہ خبر دونوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ دھماکے کی زوردار آواز سے سارا محلہ لرز اٹھا تھا۔ آس پاس کے مکانوں کے صرف در دیوار ہی ٹوٹ پھوٹ گئے، لیکن محمد افضل کی پوری زندگی زمین بوس ہوگئی۔ وہ رات ان پر قیامت بن کر گزری۔ بڑی مشکل سے کل رات جمیلہ کو قدرے ہوش آیا تھا۔ اور بڑے صبر اور ضبط سے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ محمد افضل کو بھی بیوی کے اس طرح صبر آنے پر قدرے اطمینان سا ہوا تھا۔ لیکن...... اس وقت شاید اسے

پھر جاوید کی یاد آئی ہوگی۔ وہ یونہی بے بسی کے عالم میں غسل خانے کے دروازے سے لگ کر کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید سسکیاں بند ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اسی دوران ایک زوردار چیخ کے ساتھ ہی کمرے سے پھر زور زور سے رونے کی آواز آنے لگی۔ محمد افضل دل پر پتھر رکھ کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھا جیسے کسی غیبی مدد کا متلاشی ہو۔ وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا، اس وقت اس میں جمیلہ سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ اس وقت اسے کیا دلاسا دیگا۔ کیا تسلی دیگا۔ سوچتے سوچتے وہ بیڈروم کے قریب پہنچ گیا۔ مشکل سے دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر کی طرف تھوڑا کھل گیا۔ اندر کمرے کی دھیمی روشنی میں جمیلہ بیڈ کی طرف تکیہ میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک سلسلہ تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بیوی کو اس حال میں دیکھ کر محمد افضل اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ پھر ہمت جٹا کر وہ آگے بڑھا اور جمیلہ کے قریب ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوا۔ جمیلہ خاوند کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ محمد افضل نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ ابھی خود کو سنبھال رہا تھا۔ اور ساتھ ہی تسلی کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔ کہ اچانک جمیلہ پھٹ پڑی۔

''جاوید کو کہاں چھوڑ آئے ...... کہاں چھوڑ آئے میرے جگر کو ...... مجھے جواب دو تم نے ......''

کہتے ہوئے وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔ محمد افضل بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ وہ بے بسی کے عالم میں بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر ضبط کر کے جمیلہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے کہہ پایا۔ ''جمیلہ حوصلہ رکھو...... ہم سب اللہ ہی کے......'' کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی۔ خاوند کے یہ الفاظ سن کر جمیلہ اچانک چپ ہوگئی۔ پھر خاوند کے کندھے سے لپٹ گئی۔ چند لمحے وہ اسی طرح رہی پھر کافی ضبط کر کے عجیب انداز میں خاوند سے مخاطب ہوئی۔ میں نے ابھی جاوید کو خواب میں دیکھا۔ اسکے ساتھ اس کے اور بھی دوست تھے۔ ان کے جسموں سے عجیب خوشبو آرہی تھی۔

''اچھا......'' محمد افضل جیسے بے یقینی کے عالم میں پوچھ بیٹھا۔

''ہاں ... اس خوشبو کا احساس مجھے اب بھی ہو رہا ہے، لیکن ...... لیکن'' جمیلہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔ محمد افضل کچھ نہ سمجھتے ہوئے تذبذب اور حیرانی میں جمیلہ کو غور سے دیکھنے لگا۔

پھر قدرے مردہ آواز میں کہا۔ ''لیکن کیا......''

''اس کا دایاں ہاتھ نہیں ہے...... کہہ رہا تھا، میرا دایاں ہاتھ وہی کہیں پڑا ہے۔ اسے ڈھونڈ کے لاؤ''۔ یہ کہتے ہوئے جمیلہ پر غشی طاری ہوئی۔

یہ سنتے ہی محمد افضل کی جیسے روح ہی نکل گئی۔ ٹانگیں تھرتھرانے لگی۔ اپنا آپ زمین کے اندر دھنستے ہوا محسوس ہوا۔ اس سے پہلے وہ دھڑام سے زمین پر گر جاتا، اسے اچانک نماز کا خیال آیا۔ اپنی ساری قوت مجتمع کر کے وہ دروازے کی سیدھ میں کھڑا ہوا......اور پوری قوت سے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا، اور کسی طرح وہ گھر سے باہر آیا۔ مسجد کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اسے یاد آیا کی دھماکے کے بعد ہمسایوں نے اسے پورا یقین دلایا تھا کہ انہوں نے جاوید کے سارے اعضاء اکٹھا کر کے دفنائے......لیکن...... ہاتھ......

اسے پھر اپنا آپ گرتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن ساتھ ہی مسجد سے تکبیر کی آواز نے اسے سہارا دیا۔ وہ مسجد کے اندر داخل ہوا اور جماعت میں شامل ہوا۔ نماز کے دوران بیٹے کا دایاں ہاتھ شکلیں بدل بدل کر اس کے سامنے پھرتا رہا۔ بچپن سے لیکر جوانی تک اس نے اس ہاتھ کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ایک ایک انگلی کو غور سے دیکھتا رہا......اسے یاد آیا اس نے کتنی بار اس ہاتھ کو چوما۔ اس سے سہارا لیا، اس کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ انگلیوں میں کیسے قلم پکڑتا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہمسایوں خاص کر حاجی صاحب اور عبدالصمد سے ضرور پوچھے گا کہ انہوں نے واقعی جاوید کے تمام اعضاء اکٹھا کئے تھے۔ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ سب لوگ مسجد سے نکل گئے۔ وہ دیر تک ایسے ہی مسجد میں بیٹھا رہا۔ پھر جب باہر آیا......سورج قریب قریب طلوع ہو چکا تھا۔ وہ مسجد کے صحن سے باہر آیا۔ دو تین قدم گلی میں آگے بڑھا۔ پھر اچانک رُک گیا۔ جیسے آگے گہرا اندھیرا چھایا ہو۔ جس میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک اسے صبح کا واقع یاد آیا اور ساتھ ہی جمیلہ کے کہے الفاظ ''وہ کہہ رہا تھا، میرا دایاں ہاتھ وہی کہیں پر پڑا ہے، اسے ڈھونڈ کے لاؤ''......اسکی روح کو چھلنی کرنے لگا ۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر سے ادھر دیکھنے لگا اور مسجد کے ساتھ والی گلی میں مڑ گیا۔ چند لمحوں میں وہ مین روڈ پر اس جگہ پہنچ گیا، جہاں پانچ دن پہلے دھماکہ ہوا تھا۔ یہ جگہ برلب سڑک تھی تاہم آگے چل کر کچھ اُترائی تھی۔ جہاں خود رو جھاڑیاں بکثرت اُگ آئی تھی۔ جس کے ساتھ ہی کوڑے کرکٹ کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ بے ہنگم

درختوں کے جھنڈ نے اس جگہ کو قدرے نیم تاریک بنا دیا تھا۔ محمد افضل چند لمحے سڑک سے نیچے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر نیچے اُتر کر نیم تاریکی میں جھاڑیوں کے درمیاں پہنچ گیا اور پوری شدت سے دونوں ہاتھوں سے جھاڑیوں کو توڑنے، اکھاڑنے لگا اور آنکھیں کھول کھول کر نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ بہت دیر تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک جھاڑ جھنکاڑ کاٹتا رہا، اکھاڑتا رہا لیکن اسے وہاں کچھ نہ ملا۔ پھر تھک ہار کر کوڑے کے ڈھیر کے قریب پہنچا، اسے بھی کھنگال ڈالا۔ لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ اب مایوسی کے بدلے اس کے چہرے پر غصہ تھا۔

حالت بھی عجیب تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے اُلجھ کر بازوں، ہاتھوں اور چہرے سے جگہ جگہ خون بہہ رہا تھا۔ سارے کپڑے تار تار تھے۔ وہ غصے اور بے بسی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھنے لگا، جیسے یقین ہو کہ، وہ یہیں کہیں پڑا ہے۔ اس نے ادھر سڑک کی طرف دیکھا۔ دن اچھا خاص نکل آیا تھا۔ اچانک اسے جمیلہ کا خیال آیا اور تیز تیز قدموں سے اُوپر سڑک پہ آیا اور گھر کا رخ کیا۔ گھر کے قریب پہنچ کر وہ دروازہ باہر سے بند دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کمرے میں کوئی چیز قرینے سے رکھی ہوئی ہے۔ ایک طرف قرآن شریف رکھا تھا۔ لیکن...... جمیلہ کہاں گئی، سوچتے سوچتے وہ تذبذب اور پریشانی میں کمرے سے باہر آیا۔ باہر ہمسایوں سے معلوم کیا۔ قریبی رشتہ داروں کے یہاں گیا۔ مایوس ہو کر سارے محلے میں گھوما لیکن جمیلہ کا کوئی پتا نہیں چلا۔ کسی نے پوچھا بھی، جواب نہ بن پڑا۔ چلتے چلتے پیر منوں بھاری معلوم ہو رہے تھے۔ گرتے پڑتے مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مسجد کے اندر داخل ہوا۔ دروازے کے قریب جیسے سجدے میں گر گیا۔ وہ بہت دیر تک اسی حالت میں رہا۔ پھر دور کسی دوسری مسجد سے ظہر کی اذان کی آواز کے ساتھ اس نے سر اُوپر اٹھایا، نہ جانے کیوں دل کو قدرے اطمینان آیا تھا۔ ڈوبتے بھاری قدموں سے پھر گھر کا رخ کیا۔ دروازہ کھلا تھا، اوپر کمرے میں پہنچا۔ وہاں جمیلہ بڑے سکون کے ساتھ تلاوت کر رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بے یقینی کے عالم میں اسکے قریب آیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا ہی چاہا کہ جمیلہ نے سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا۔ اسکے چہرے پر عجیب طرح کے تاثرات تھے جنہیں وہ سمجھنے سے قاصر تھا، ''اتنی دیر کہاں لگادی''۔ اسے جمیلہ کی آواز جیسے بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ بت

بنا اسے دیکھتا رہا۔ ''وہ ادھر امانت پڑی ہے، پہنچادو'' ...... جمیلہ نے کہتے ہوئے کمرے میں ایک طرف رکھے چھوٹے میز کی طرف اشارہ کیا، محمد افضل نے نہ چاہتے ہوئے ادھر دیکھا۔ میز پر ایک چھوٹا سا تھیلہ بڑے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ جس میں کوئی چیز تھی۔ محمد افضل چند لمحے خالی خالی آنکھوں سے سفید تھیلے کو دیکھتا رہا پھر اچانک جیسے کسی نے اسکا کلیجہ دونوں ہاتھوں سے زبردستی کھینچ کر جسم سے باہر نکال دیا۔ وہ تھیلے کو دیکھتے دیکھتے وہیں نیچے بیٹھ گیا...... ''جب تم بہت دیر تک نہیں لوٹے، میں نے قرآن پاک اتار کر تلاوت شروع کی۔ جس کے دوران مجھے اونگھ سی آ گئی۔ میں نے پھر جاوید کو دیکھا، کہہ رہا تھا، ابو کو میرا ہاتھ نہیں مل رہا ہے۔ امی تم جاؤ، وہ ٹھیک بڑے پیڑ کی ایک نچلی والی موٹی شاخ پر پڑا ہے'' ۔ کہتے کہتے جمیلہ کی آواز رُندھ گئی۔ لیکن اس نے ساتھ ہی زور سے پھر تلاوت شروع کی۔ محمد افضل جیسے زمین میں اندر دھنس گیا تھا۔ وہ کبھی جمیلہ کو اور کبھی میز پر رکھے سفید تھیلے کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کے انکے سہارے کھڑا ہوا۔ میز کی طرف قدم بڑھائے، قریب پہنچ کر آنکھیں بند کی۔ ہاتھ بڑھایا اور تھیلا اٹھایا۔ وہ آنکھیں کھولے بغیر اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ باہر آ کر اس نے تھیلے کو کندھے پر رکھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا، وہ آج اپنے بیٹے کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے، جو اسے بہت بھاری معلوم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

زاہد مختار

لمحے کا سفر

جب وہ گھنٹہ گھر تعمیر کیا گیا تھا تب ''اکبر جو'' اپنی سرکاری نوکری کے آخری سال میں تھا۔ اُسکے دفتر میں بھی اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے تھے کہ لیڈر لوگ یہ سب کچھ اپنی پبلسٹی کے لئے کرتے ہیں۔ کارنامے انجام نہیں دیئے جاتے۔ فنڈس میں ہیرا پھیری عروج پر ہے لیکن شہر کے مین چوک کے وسط میں ایک ''ماڈرن گھنٹہ گھر'' تعمیر کر کے ''حاتم'' کی قبر میں سرسراہٹ پیدا کی جارہی ہے۔

اُس دن ٹھیک دن کے بارہ بجے تھے جب نہایت ہی کروفر کیساتھ ''حاکم وقت'' کا کارواں اُس مقام تک آیا تھا۔ گھنٹہ گھر کو مختلف رنگوں کی ڈیوڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ اکثر دیکھنے والوں کو گھنٹہ گھر کی بجائے ڈیوڈیاں اور لیڈر کے لئے تیار کیا گیا بلند و بالا آسمان کو چھوتا ہوا اسٹیج ہی نظر آرہا تھا۔ پریس والوں کے ڈیجیٹل کیمرا بھی اُس گھنٹہ گھر کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ لیکن جب لیڈر اپنے وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ آنے کے باوجود جلوہ گر ہوا تو کیمرا کے ساتھ ساتھ ہر ذی حس کی آنکھ اُس کے ہی کلوز اپ تک محدود کر رہ گئی۔ لوگوں کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر گھنٹہ گھر پر لگی ہوئی خوبصورت گھڑی کو ''وقت کا سفر'' شروع کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے بے تاب تھا لیکن اُن سوئیوں کی حرکت یا تو لیڈر نے دیکھی یا پھر اُس کے کمانڈوز نے۔ عام لوگوں کو دوسرے دن سے پتہ چلا کہ واقعی گھنٹہ کی وہ گھڑی اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ اور یوں لوگوں کی عام و خاص گھڑیوں کے ساتھ ساتھ اکبر جو بھی اپنی نوکری کے آخری ایام میں اپنی پرانی سی گھڑی کا وقت اُس گھنٹہ گھر کی گھڑی کے ساتھ ملاتا رہا۔ تب تک جب تک وہ باضابطہ طور ریٹائر نہیں ہوا۔

پھر وہ ہوا جو تواریخ کے پرانے، زردی مایل صفحوں میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایکدن گھنٹہ گھر کی یہ گھڑی اچانک رُک گئی۔ لوگوں کیلئے یہ بات عام سی تھی لیکن اکبر جو کے گھر

میں اُسی دن ایک بھونچال آ گیا۔ صبح سویرے اخباری ہاکر چلا چلا کر جو شہ سرخی بیان کر رہے تھے اُس کا ایک ایک لفظ اکبر جو کے جسم وجگر کو چھلنی کر رہا تھا۔ شہر کے اُس چوراہے پر اُس رات ایک آدمی کا خون ہوا تھا۔ لاش صبح کو پولیس والے لے گئے تھے اور پھر مقتول کے وارثین، لیکن کہتے ہیں رات بھر کتے اُس کا خون چاٹتے رہ گئے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ کتے اُس لاش کے کپڑوں کو بھی دانتوں سے ادھیڑنے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن بھلا ہو اُن کی حیوانیت کا کہ وہ تب تک آپس میں گتھم گتھا ہو گئے جب تک موذن نے فجر کی اذان نہ دی اور یوں ایک خاکروب نے اُس لاش کو پہلی بار دیکھا اور پھر جب تک اُس کی شناخت کا مرحلہ آیا تب تک اکبر جو کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ اُس کے گھر اُسکے جوان اکلوتے بیٹے کی لاش پہونچ چکی تھی۔

اس واقعے کا چرچا کئی دنوں تک رہا۔ لواحقین کے گھر میں بھی ماتم چار دن تک ہوا اور لوگ پھر زندگی کے سفر میں گم ہو گئے۔ پورے شہر کے لئے اس گھنٹہ گھر کی گھڑی کا بند ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہر کوئی اپنے حساب سے اپنے وقت پہ چلتا ہے۔ دوسرے کی گھڑی ہو یا گھنٹہ گھر کی گھڑی یہ سب تب اپنا احساس دلاتی ہیں جب اپنی گھڑی کی سوئیاں تھک جاتی ہیں۔ لیکن............!!

کسی کو وقت کا احساس ہو یا نہ ہو۔ وقت اپنا احساس دلا ہی دیتا ہے۔ ایکدن یہ خبر پورے شہر میں گردش کرنے لگی۔ اخبارات کی شہ سرخیوں نے بھی اسے اپنی پلکوں پر بٹھایا۔ مذہبی، سیاسی اور سماجی انجمنوں میں یہ بات موضوع بحث بن گئی کہ گھنٹہ گھر کی گھڑی بند ہو گئی ہے۔ کچھ انجمنوں نے حکومت کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ اسمبلی کے ایوان میں بھی گھنٹہ گھر کی گھڑی نے اپنی اہمیت کا گھنٹہ بجایا لیکن۔ مختلف غیر سرکاری اور سرکاری جماعتوں کی جانب سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے باوجود اُس گھڑی کی عملاً کوئی مدد نہ کی جاسکی۔ اُسکی دونوں سوئیاں بارہ بجے رات سے ایک لمحہ قبل اپنی موت کا اعلان کر چکی تھیں یا پھر ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواستگار دکھائی دے رہی تھی۔ افسوس اس بات کا تھا گھڑی کی دھڑکنیں اُس رات اپنے بارہ گھنٹے بجانے سے پہلے ہی بند ہو گئیں تھیں۔ اُس رات کسی نے اُس گھڑی کی آخری چیخ بھی نہیں سُنی تھی۔

وقت کا یہ مرہم بھی عجیب ہے کہ وہ بڑے بڑے زخموں کا مداوا کرتا ہے۔ ایک دہائی

گذر گئی۔ وقت نے ہزاروں کروٹیں لی۔ سماجی، سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے کئی قائد منوں مٹی تلے دفن بھی ہو گئے بالکل اسی طرح جس طرح یہ گھنٹہ گھر کی گھڑی کا معاملہ بھی دفن ہو گیا۔ پہلے پہلے تو اُس شاہراہ پر چلنے والے لوگ اُس بند گھڑی کی طرف غیرارادی طور پر دیکھتے تھے لیکن اُس جانب دیکھنے کی عادت بھی یاد رفتہ ہو گئی تھی۔ پورے شہر میں جیسے اُس گھڑی کی اہمیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ سماجی لیڈروں کے سامنے نت نئے مسائل اپنی تازگی کا احساس دلا رہے تھے۔ مذہبی لوگوں کو اپنے اختلافات کا سد باب تلاش کرنے سے فرصت نہیں تھی۔ اور سیاسی بحران نے ایک ''نئی شکل'' اختیار کر کے سب کچھ اُلٹ پلٹ کر دیا تھا۔ اب ایسے میں کس کے پاس اتنی فرصت تھی کہ وہ ایک گھنٹہ گھر کی گھڑی کو ٹھیک کرنے کی ''فضول'' سی سوچ کو اپنے ذہن و دل میں جگہ دے دیتا۔ لے دے کے بس وہ بوڑھا اکبر جو تھا۔ جس کے بیٹے کی لاش کے خون کو رات بھر کتے اسی گھنٹہ گھر کے سامنے چاٹ چکے تھے۔ وہ آج بھی ہر جمعہ کو قریب کی ایک مسجد سے نماز پڑھنے کے بعد اُس گھنٹہ گھر کی فلک بوس عمارت کے سامنے آ کر رُک جاتا۔ اُسکی پُرنم آنکھوں میں ایک ہی سوال موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا۔

''اے گھڑی کیا تم نے اُن قاتلوں کو دیکھا ہے؟''

لیکن گھڑی اُس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے پاتی۔ وہ آج بھی ہاتھ جوڑ کر جیسے اپنی بے زبانی یا پھر اپنی بے بسی اور بزدلی کے لئے معافی مانگتی۔ اور بوڑھا ہر ہفتے ایک نئی آس لئے اُس گھنٹہ گھر کے سامنے ایستادہ ہو جاتا کہ شاید اب کے کوئی 'معجزہ' ہو اور وہ گھڑی کچھ بول سکے۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے اور کتابوں کا لکھا ہی سچ ہوتا ہے کہ ''اب معجزے نہیں ہوا کرتے'' کیونکہ ''معجزوں کا موسم'' کب کا گذر چکا ہے۔

اس بات کا احساس بوڑھے شخص کو بھی تھا۔ پھر بھی وہ محلے کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی بجائے گھنٹہ گھر کے قریب ایک جامع مسجد میں سر جھکانے آتا تھا۔ کیونکہ ہر جمعہ کی صبح کو جب وہ اپنی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے اپنی تنہائی اور بے بسی کی مورت اپنی فالج زدہ بوڑھی بیوی کو دیکھتا تھا تو اُسے اپنا سہارا یاد آتا تھا جو جمعہ کے روز ہی گھر سے نکل کر ماں کے لئے دوائیوں کا انتظام کرنے گیا تھا۔ لیکن نہ دوائیاں آئیں، نہ بیٹا اور نہ ہی بوڑھے کی بیوی کو موت ہی آئی۔ بیچاری اپنے بیٹے کے آنے کی امید میں ایسے ہی بستر پر

بے حس و حرکت پڑی رہتی تھی۔ دروازے کی جانب آنکھیں بچھائیے۔ بدنصیب کو کسی نے اتنے سالوں تک یہ خبر بھی تو نہیں سنائی تھی کہ اُس کا بیٹا اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ خود اُس کا اپنا شوہر بھی تو اس معاملے میں گھنٹہ گھر کی گھڑی کی طرح سچ کہنے کی جسارت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس لئے شاید وہ ہر جمعہ کو اُس علاقے میں آکر ایک ''سچ'' کی تلاش کرتا تھا۔ لیکن.........!

''سچ'' تو اب شہر کے وسیع و عریض قبرستان کو پر کرتا ہوا شہر و گام کے میدانوں میں بھی دفن ہو چکا تھا۔ ایسے میں بھلا ایک بوڑھے، نحیف، بے سہارا شخص کو بھلا ''سچ'' نظر آتا تو کہاں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن بوڑھے کی فالج زدہ بیوی کی آنکھوں میں امید کے چراغ گل ہو گئے اور پھر بوڑھے کے کانپتے قدموں، تھرتھراتے ہاتھوں اور پرنم آنکھوں نے اُسے کفن میں لپیٹ کر جمعہ نماز سے پہلے ہی اپنے آخری سفر کے پہلے پڑاو تک پہونچا دیا۔ ایک جانب بوڑھے کے دل پر عمر بھر کے ساتھی کی جدائی کا غم پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا تھا لیکن دوسری جانب اُسے کم از کم یہ اُمید تو تھی کہ اب ایک ماں کا لمبا انتظار ختم ہو چکا ہو گا کیونکہ اب وہ اپنے بیٹے کے پاس پہونچ چکی ہو گی۔

اس واقعے کو بھی ایک سال گذر گیا یعنی گھنٹہ گھر کی گھڑی کو اب بند ہوئے پورے بارہ سال ہو چکے تھے۔ ان بارہ سالوں میں نہ جانے کتنی زوردار بارشیں آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی زمیں کی چھاتی کو پھاڑنے کی سعی کرتی رہیں۔ کتنی بار تیز و تُند ہواؤں نے شہر کی لاتعداد چھتوں کو جہلم کے سوکھے قبرستان میں دفن کر دیا لیکن گھنٹہ گھر کی گھڑی کے دونوں بازو ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً ملے ہوئے اب بھی اپنے اُس ایک لمحے کا سفر طے کرنے سے قاصر تھے۔ اب تو وہ بوڑھا بھی ایک ''سچ'' کی تلاش میں وہاں نہیں آتا تھا۔ اُسکے پاس پڑوسی کہتے ہیں کہ اب وہ محلے کی مسجد میں جانے کے قابل بھی نہیں رہا ہے کیونکہ اُسکی پُرنم آنکھیں اب بے نور ہو گئی تھیں۔ وہ اب اپنے حجرے کے ایک کونے میں کسی فرد کی مزاج پرسی کو آنا ہی اپنا مقدر سمجھ چکا تھا۔ حالانکہ آنے والے بھی اب اپنے غم دوراں کے افکار میں یوں الجھے تھے کہ اُنہیں خود اپنے گھروں کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں ایک معصوم دیا جلانے کی بھی جسارت نہیں ہوتی تھی۔

یہی حال لگ بھگ اُس گھنٹہ گھر کی گھڑی کا بھی تھا۔ فلک بوس عمارت کے ماتھے پر

لگے ہوئے ایک داغدار چاند کی مانند وہ گھڑی خود اپنے گرہن کی سالگرہ پر سالگرہ مناتی گئی تنہا تنہا۔ لیکن...... ایک دن......

وہ سب کچھ جیسے ایک معجزے کی طرح اچانک ہوگیا۔ سارا شہر اُس سرد برفیلی رات کے سناٹے میں اپنی اپنی نیند میں ہڑ بڑا کے جاگ پڑا۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی اچانک اپنا وہ ایک لمحہ طے کر کے پورے بارہ گھنٹے بجا رہی تھی۔ اپنی پوری آواز کے ساتھ۔

دوسرے دن لگ بھگ سارا شہر یہ دیکھنے کے لئے گھنٹہ گھر کے آس پاس اُمنڈ آیا کہ آخر گھنٹہ گھر کی گھڑی خود بخود کیسے ٹھیک ہوگئی؟

سب کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔ ''آخر یہ سب کیسے ہوا؟'' لیکن اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ گھڑی بلاشبہ اپنے پورے جوش کے ساتھ وقت کی رفتار تھام چکی تھی۔ اُسکے ساتھ ساتھ جیسے سارا شہر بھی متحرک ہو چکا تھا۔ لیکن کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا کہ آخر اس گھڑی کے دل کو کس نے پھر سے دھڑکنیں عطا کیں۔

شام دیر تک لوگ ٹی۔ وی۔ ریڈیو اور اخبارات کے ایوننگ ایڈیشنز میں اپنے اس واحد سوال کا جواب تلاش کرنے لگے لیکن اب کی بار نہ کسی ٹی وی چینل نے اس بارے میں کوئی فلش ہی منصۂ شہود پر لایا اور نہ کسی اخبار نے اس نوعیت کی کوئی شہہ سرخی ہی صفحہ قرطاس کی زینت بنائی۔

دوسرے دن لوگوں کے چہرے مایوسی کے اندھیروں میں لپٹے ہوئے نظر آرہے تھے کیونکہ ایک سنسنی خیز بات کا راز ہنوز وقت کے دبیز پردوں میں چھپا تھا۔ اور گھنٹہ گھر کی گھڑی کا صحیح وقت تو جیسے پورے شہر کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ آج وہ گرہن زدہ چاند جیسے مسکرا رہا تھا۔ اپنی طرف دیکھنے والوں کو اپنی ٹِک ٹِک سے اپنی زندگی کا وہ راگ سنا رہا تھا جس راگ کو اس شہر کے سارے لوگ برسوں سے بھول گئے تھے۔ لیکن لوگوں کو اب اس راگ سے زیادہ اس راگ کے سروں میں چھپے راز کو سرِ عام عریاں دیکھنے کی تمنا تھی اور جب یہ بات نابینا بوڑھے کے کانوں تک بھی پہونچی تو وہ بھی گرتا پڑتا اپنی دہلیز تک آیا۔ وہ بار بار اپنے آس پاس کے لوگوں سے ایک ہی التجا کر رہا تھا کہ وہ بھی اُس ٹِک ٹِک کرتی ہوئی گھڑی کے قریب جانا چاہتا ہے۔ لوگ اُسکی التجا کو اَن سنی کر رہے تھے جیسے اُن سبھوں کی آنکھیں تو تھیں لیکن اُن کے کانوں کے پردوں میں کسی نابینا کے الفاظ کوئی ارتعاش پیدا

نہیں کر رہے تھے۔

بوڑھا اپنے ہاتھ آگے پسار کر گویا اپنی التجا کی جھولی پھیلا کر ملتمس تھا۔

"بھائی اندھا ہوں تو کیا ہوا۔ کانوں سے تو وقت کی آواز سننا چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے اُس گھنٹہ گھر تک لے جاو۔"

لیکن کسی نے بوڑھے کی خالی جھولی میں ہمدردی کے دو بول بھی نہ ڈالے۔

بلآخر وہ خود اپنی پینشن کے چند سکوں سے ایک آٹو والے کو گھنٹہ گھر تک چلنے پر آمادہ کر سکا۔ گھنٹہ گھر کے پاس دور دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کا اژدھام بھی بڑھنے لگا تھا۔ بوڑھا آٹو میں ہی بڑے انہماک کے ساتھ کان لگائے گھڑی کی ٹِک ٹِک سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسکے دل میں اب ایک "نیا سچ" جاننے کی طلب انگڑائیاں لے رہی تھی۔ بڑھتے ہوئے جم غفیر کو دیکھ کر آٹو والے کو اپنے آٹو کی فکر ستانے لگی اور جوں ہی اُس نے بوڑھے سے واپس چلنے کے لئے کہنا چاہا تو اُسے یوں لگا جیسے بوڑھے نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر پھر سے دیکھنا شروع کر دیا ہو۔ وہ سچ مچ ویسے ہی اُس ٹِک ٹِک کرتی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے عام چشم بینا رکھنے والے لوگ اُس گھڑی کو دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا دھیرے دھیرے زیرلب مسکرا کے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ آٹو ڈرائیور نے حیرت زدہ ہو کر بوڑھے کے لبوں کے قریب اپنے کان لے جانے کی سعی کی لیکن اسی اثناء میں ایک اخباری ہاکر زور زور سے تازہ ترین اخبار کی ایک شہہ سرخی چلا چلا کر بیان کرتا ہوا وہاں سے گذر گیا۔

"پڑھیے آج کی تازہ خبر۔ کل رات ایک لاوارث پنڈت کا انتم سنسکار اُسکے ہمسایہ مسلمان بھائیوں نے ادا کیا۔ پڑھیے آج کا تازہ پرچہ۔"

اکبر جو اپنی سیٹ پر زیرلب مسکراتے ہوئے دم توڑ چکا تھا۔

☆☆☆

ترنم ریاض

شہر

پلاسٹک کی میز پر چڑھ کو سونو نے نعمت خانے کی الماری کا چھوٹا سا کواڑ وا کیا تو اندر قسم قسم کے بسکٹ، نمک پارے، شکر پارے اور جانے کیا کیا نعمتیں رکھیں تھیں۔ پل بھر کو وہ ننھے سے دل پر کچو کے لگا تا ہوا غم بھول کر مسکرا دیا۔ اور نائٹ سوٹ کی لمبی آستین سے سوکھے ہوئے آنسوؤں بھرے رخسار پر ایک اور تازہ بہا ہوا آنسو پونچھ کر اس نے بسکٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لے لیا اور اپنے پانچ سالہ وجود کا بوجھ سنبھالتا میز سے نیچے اتر آیا۔ اسے بھوک بھی بہت لگی تھی۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا، اس کی چھوٹی سی اڑھائی برس کی بہن ثوبیہ بھی صبح سے بھوکی تھی۔ سارا دن وہ مسہری پر لیٹی اپنی ممی کو پکار پکار کر تھک گئی تھی۔ اور بہت زیادہ روتے رہنے کے باعث نڈھال سی ہو کر اس نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا ننھا سا سر اپنی امی کے پھیلے ہوئے بازو پر رکھ چھوڑا تھا...... دن بھر شاید وہ سوتی رہی تھی اور کچھ دیر پہلے ہی اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

اس شہر میں آئے انھیں صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔

امان کو بہت عرصے سے اس شہر میں اپنی تبدیلی کروانے کی خواہش تھی لیکن اس میں بس ایک ہی پریشانی تھی کہ رہائش کا انتظام نہایت مشکل کام تھا۔ اُس کے قصبے کے انوار صاحب بھی اس کمپنی میں کام کرتے تھے مگر وہ ہیڈ آفس سے وابستہ تھے اور شہر میں رہائش پذیر تھے۔ رہائش بھی کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی تھی کیونکہ وہ پچیس برس سے اسی دفتر میں تھے۔ اُس کے بعد آنے والے ملازمین میں سے بہت کم کو فلیٹ میسر آیا تھا۔ غیر شادی شدہ لوگ تو ایک کمرے والی رہائش میں دو یا تین تین کے حساب سے ہوسٹل کی طرح کمرہ بانٹ لیتے تھے مگر فیملی والے ارکان کے لئے یہ مسئلہ سب سے پیچیدہ تھا۔

امان اپنے قصبے میں کمپنی کا برانچ منیجر تھا۔ انوار صاحب ہر تین ماہ کے بعد اپنی کمپنی کا کوئی کام نکال کر اپنے آبائی گھر آتے۔ بزرگ والدین سے ملاقات بھی ہو جاتی اور کمپنی

کا کام بھی نمٹا لیتے۔

اس بار انوار صاحب اپنے ساتھ امان کے لئے کچھ سپنے بھی لے آئے تھے۔ بڑے شہر میں رہنے کے۔ بچوں کو بڑے بڑے سکولوں میں تعلیم دلوانے کے اور ہیڈ آفس میں رہ کر ترقی کے نئے راستے وا ہونے کے۔

وہ ریٹائرمنٹ لے رہے تھے اور امان کے لئے ٹرانسفر کی بات بھی کر آئے تھے۔

امان اگر بروقت نہ پہنچتا تو اُسے اور کچھ برس انتظار کرنا پڑتا اور فیملی فلیٹ اُسے جب ہی ملتا جب فیملی ساتھ ہوتی۔ ورنہ اسے بیچلر رومز میں رہنا تھا۔ انوار صاحب نے فلیٹ کی چابی ابھی دفتر میں جمع نہیں کرائی تھی۔ وہ یہ کام امان کی موجودگی میں کرانا چاہتے تھے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر اُن کی عزت کرتے تھے، انہیں یقین تھا کہ وہ اُن کی بات مان لیں گے۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا آنے کی کوشش کرتا، وہ کسی کی علمیت سے پیشتر امان کے حق میں فیصلہ چاہتے تھے۔

امان نے دو دن کے اندر ساری تیاریاں مکمل کر لیں اور مع بابرا اور بچوں کے شہر روانہ ہو گیا۔ انور صاحب کا فلیٹ ۱۴ منزلہ عمارت کا سب سے اوپری فلیٹ تھا۔ عمارت کی ہر منزل پر تین تین فلیٹ تھے مگر سب سے اوپر والی منزل میں یہی ایک فلیٹ تھا۔ کیونکہ ایک طرف ڈش انٹینا تھا اور دوسری طرف پانی کی ٹینکیاں۔ درمیان میں یہ ایک فلیٹ بن پایا تھا۔ اس کے اوپر بڑا سا کشادہ ٹیرس تھا جس میں تقریبات وغیرہ ہوا کرتیں۔ وہاں سے نیچے دیکھنے پر سارا شہر دُلہن کے ستارے لگے آنچل کی طرح نظر آتا۔

اس سے نیچے کے تین فلیٹس میں سے دو آباد تھے اور ایک پر کچھ تنازعہ چل رہا تھا۔ ایک فلیٹ کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ایک میں امان کی ہی کمپنی میں کام کرنے والے وکرم بھسین رہتے تھے۔

بابرا کو فلیٹ اور امان کو شہر بہت پسند آیا۔ فلیٹ کشادہ تھا۔ تین خوابگاہوں، ڈرائنگ روم اور باورچی خانے پر مشتمل۔ ہر کمرے کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ اور لباس بدلنے کے لئے چھوٹا سا احاطہ۔ اونچی چھتیں، بڑی بڑی کھڑکیاں، لمبے لمبے دروازے۔ تین دن میں فلیٹ سج گیا۔ ضرورت کا سب سامان آ گیا سوائے ٹیلیفون کے۔ ٹیلیفون کی فیس پچھلے تین ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی اور ان مہربانیوں کے بدلے امان کو انوار صاحب کے لئے اتنا تو

کرنا ہی تھا۔ ورنہ خوامخواہ انوار صاحب کی گریجویٹی وغیرہ متاثر ہوتی۔ بلکہ امان کو تو کئی مہینے کا بجلی کا بل بھی بھرنا پڑا تھا تب جا کر بجلی کی سپلائی بحال ہوئی۔ ٹیلیفون کا بل ادا کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ امان نے پہلے دن آفس جوائن کرنے کے بعد دوبارہ آفس کا رخ تک نہیں کیا تھا کہ بغیر بجلی کے اس شہر میں ایک دن کے لئے بھی رہنا مشکل تھا اور سارا وقت اُسے ادھر اُدھر بھٹکنا پڑا تھا۔

کوئی پانچویں دن امان دفتر گیا کہ بھسین صاحب کے فلیٹ میں اُس کے لئے فون آیا تھا۔ اُسے سائٹ پر جانا تھا اور واپسی دوسرے دن کی تھی۔ وہاں کچھ ایسا کام پڑ گیا کہ امان دوسرے دن نہ آسکا۔

صبح دروازے کی گھنٹی بجی تھی تو سونو کی آنکھ اُسی آواز سے کھل گئی تھی۔ ممی اور ثوبیہ سو رہی تھیں۔ سونو دروازے تک گیا اور اس نے دروازے کی نچلی چٹخنی بھی کھولی تھی مگر میز پر کھڑے ہونے کے باوجود اُس کا ہاتھ دروازے کے اوپر والی چٹخنی تک نہ پہنچ سکا۔

''جی کون ہے؟'' اُس نے پکارا بھی تھا مگر باہر سے کوئی جواب نہ آیا۔ آنے والے نے شاید اُس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اور دروازہ نہ کھلنے پر لوٹ گیا تھا۔

''ممی۔ کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔ ممی...... ممی۔'' اُس نے کئی بار ممی کو پکارا تھا مگر ممی جانے آج کیسی نیند سو رہی تھیں۔ جاگ ہی نہیں رہی تھیں۔

''ممی...... ممی جی...... کوئی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔'' اُس نے اونچی آواز میں پکارا تو ثوبیہ نے ابروؤں کے رخ پر خمیدہ پلکوں والی منی منی آنکھیں کھول دیں۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر ادھر اُدھر دیکھا اور بھائی کو ممی پکارتے سن کر خود بھی ممی ممی پکارنا شروع کر دیا۔

مگر ممی بول ہی نہیں رہی تھیں۔ ممی کے دہانے کے چاروں طرف کوئی سفید چیز جمی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی کچھ عجیب طرح سے پھیلے ہوئے تھے۔

ثوبیہ نے ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر رونا شروع کر دیا۔

''چپ ہو جا۔ روتی کیوں ہے''۔ سونو نے جھلا کر کہا تو ثوبیہ اور زور زور سے رونے لگی۔

''ممی سو رہی ہیں ثوبی۔'' وہ بہن کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''ممی۔ ممی اُٹھیے نا۔'' سونو نے پھر ماں کو جگانے کی کوشش کی۔ جب تک دروازے کی

گھنٹی دوبارہ بجنے لگی تھی۔
''کون ہے......'' وہ دروازے کے قریب جا کر اور اونچی آواز میں بولا۔کوئی جواب نہ آیا۔وہ واپس کمرے میں آیا۔ثوبیہ با قاعدہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔سونو کچھ دیر ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا۔پھر روتی ہوئی بہن کو بغور دیکھنے لگا۔
''ممی۔'' اُس نے ممی کو پوری طاقت سے جھنجھوڑا مگر ممی بے حس و حرکت پڑی رہیں۔
وہ کچھ دیر گم سُم سا بیٹھا رہا۔پھر ثوبیہ کے قریب جا کر اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھے۔
''نہیں رونا ثوبی۔ممی سو رہی ہیں۔'' مگر ثوبی تھی کہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔
''چپ ہو جا۔'' وہ چیخا اور ساتھ ہی دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔
جانے کب تک دونوں بہن بھائی روتے رہے مگر امی نے چپ ہی کرایا نہ کچھ بولیں۔ ثوبیہ کوئی گھنٹہ بھر رونے کے بعد تھک کر سو گئی۔
وہ سو گئی تو سونو پھر ماں کے قریب گیا۔اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر دائیں بائیں ہلانے لگا۔
''ممی۔'' اس نے زور زور سے ممی کا سر ہلایا ''ممی......ممی جی۔'' اُس نے آنسوؤں میں بھیگی آواز میں محبت گھول کر پکارا۔ممی نے کوئی جواب نہ دیا۔کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ ڈرائنگ روم چلا گیا۔پردہ سرکا کر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔
سامنے ایک بڑا سا پارک تھا جس میں چھوٹے چھوٹے کھلونوں جیسے رنگ برنگے بچے کھیل رہے تھے۔پارک میں کئی طرح کے چھوٹے بڑے جھولے لگے ہوئے تھے ادھر اُدھر آئس کریم اور ویفرس کے پیکٹ والے چھوٹی چھوٹی ہاتھ گاڑیاں لئے ہوئے گھوم رہے تھے۔ایک ریڑھی پر نہایت ننھی ننھی بوتلوں میں کولڈ ڈرنکس سجی ہوئی تھیں۔پارک کی دوسری جانب لمبی سی سڑک پر چھوٹی چھوٹی بے شمار گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔سونو نے یہ ساری چیزیں اس قدر چھوٹی جسامت میں آج سے پہلے کبھی نہ دیکھیں تھیں۔اُس کے ذہن میں عجیب عجیب سوال اور خیال اُبھرنے لگے وہ کمرے میں لوٹ آیا۔
''ممی جی۔'' اُس کے سینے سے درد بھری کراہ نکلی۔اور اُس نے اپنا چھوٹا سا سر ممی کے سینے پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے سسکنے لگا۔آنسوؤں سے ممی کے شب خوابی کے لباس کا

گریبان بھیگ بھیگ گیا مگر ممی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ رو رو کر جب وہ ہلکان ہو گیا تو اسے نیند آ گئی۔

جانے کتنا وقت وہ سوتا رہا۔

''چھو۔ چھو۔'' نیند میں اس کے کانوں میں ثوبیہ کی آواز پڑی تو اس نے آنکھیں کھلو دیں۔

''چھو چھو'' ثوبیہ نے ممی کی طرف سے نظر ہٹا کر بھائی کو دیکھ کر کہا۔

''سوسو کرنا ہے؟'' سونو نے پوچھا تو اُس نے سر اُوپر سے نیچے کی طرف ہلایا۔ سونو نے غسل خانے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

باہر شام ہو چکی تھی۔

ثوبیہ باتھ روم سے آ کر ماں کے پاس لیٹ گئی۔

''ممی ...... مم...... ممی۔'' ثوبیہ نے اپنی شہادت کی انگلی سے ماں کی آنکھ کھولنے کی کوشش کی...... وہ ناکام ہو کر پھر رونے لگی۔

ممی ی ی...... '' وہ ممی کو پکارتی ہوئی ہچکیاں لینے لگی۔

سونو بہن کو بے بسی سے دیکھتا رہا۔

''ممی اُٹھیئے نا...... ممی جی...... ثوبی رو رہی ہے۔ اُسے بھوک لگی ہے۔''

وہ گلو گیر آواز میں ماں سے مخاطب ہوا...... اُسے خود بھی بھوک لگی تھی مگر جب تک اُس نے ثوبیہ کی بھوک کا ذکر نہ کیا اس طرف اُس کا خیال نہ گیا تھا۔

اب اُسے بھوک کا احساس ہونے لگا۔

وہ ماں کے پاس سے اُٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ تمام برتن دھلے دھلائے رکھے تھے۔ کسی میں کچھ کھانے کو نہ تھا۔

اُس نے ریفریجریٹر کھولا...... اُس میں سیب رکھے تھے...... وہ دو سیب اُٹھا کر کمرے میں آ گیا۔

ایک سیب کو خود کترنے لگا اور دوسرا ثوبیہ کو پکڑا دیا۔ ثوبیہ اسے کھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اُس کے منہ میں اُگے آٹھ دانت سیب کے سخت چھلکے کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور وہ محض سیب کی سطح پر ایک آدھ نشان لگا کر رہ گئی اور چپ چاپ بھائی کو دیکھنے لگی۔ سونو نے سیب کا ایک ٹکڑا توڑ کر دیا تو وہ اُس چبانے کی کوشش میں منہ کے اندر ادھر اُدھر گھماتی

رہی اور آخر کار نگل گئی۔

دونوں سیب ختم ہو گئے تو سونو ریفریجریٹر میں پڑا آخری سیب اُٹھا لایا...... کچھ دیر دونوں بہن بھائی سیب پر زور آزمائی کرتے رہے۔ اس سے فارغ ہو کر پھر ممی کو جگانے کی کوشش کرنے لگے۔

ممی کچھ نہ بولی تو وہ رو رو کر ممی کو ہلانے لگے۔ گھر میں اتنی گرمی تھی مگر ممی کا بدن ایک دم ٹھنڈا پڑا ہوا تھا...... پتہ نہیں کیوں۔

پھر کسی وقت انھیں نیند آ گئی۔

دوسری صبح بھی ممی نہیں اُٹھیں۔ دروازے کی گھنٹی دو بار بجی تھی۔ جس سے سونو جاگ گیا تھا۔

''جی...... ای ای...... کون ہے۔'' کوئی جواب نہ آیا۔ شاید مضبوط دیواروں اور بھاری دروازے کے اُس پار اُس کی کم سِن آواز پہنچ نہیں پائی تھی اور آنے والا پھر لوٹ گیا تھا۔

ثوبیہ نے جاگتے ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ اور ممی کے پاس جا کر زور زور سے چیختے ہوئے رو رو کر جب مایوس ہو گئی تو ہچکیاں لیتی ہوئی باہر آ گئی......!

اُس کا پھول سا چہرہ کمھلا گیا تھا۔

باورچی خانے میں سونو ریفریجریٹر کھولے بغور اندر دیکھ رہا تھا۔ پرسوں کا پڑا ہوا دودھ پھٹ چکا تھا۔ ثوبیہ کو قریب دیکھ کر اُس نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''دودھ پیئے گی۔'' اُس نے ممی کی طرح پوچھا تھا۔

''ہوں۔'' وہ زور زور سے سر ہلا کر بولی۔

اُس نے پھٹا ہوا دودھ چمچ سے ثوبیہ کے فیڈر میں ڈالنے کی کوشش میں بہت سا دُودھ گرا کر تھوڑا سا ڈالنے میں کامیابی حاصل کی اور فیڈر بہن کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں تھما دیا۔

ثوبیہ وہیں فرش پر چت لیٹ کر دودھ پینے لگی۔ جب پھٹے ہوئے دودھ کا کوئی ٹکڑا ربر کے نپل کا چھید بند کرنے لگتا، وہ پیر پٹخ پٹخ کر پوری طاقت سے دودھ پینے کی کوشش کرنے لگتی اور رونے لگ جاتی پھر خود ہی چپ ہو جاتی۔

سونو نے دودھ کے کچھ بچے ہوئے چمچ خود بھی پیئے اور ثوبیہ کے پاس جا بیٹھا...... بوتل خالی ہوئی تو ثوبیہ اُٹھ کر بیٹھ گئی...... پھر کھڑی ہو کر ممی ممی پکارتی ہوئی خوابگاہ میں چلی گئی۔

سونو بھی کمرے میں آ گیا۔ اور کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا ہو کر ماں کو دیکھنے لگا۔ ممی کی شکل آج اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

مسز بھسین کی جز وقتی ملازمہ صبح اوپر آئی تھی تو کسی نے دروازہ نہیں کھولا تھا......

دراصل اماں نے اُن کے ہاں فون کیا تھا کہ بابرا کو بتا دیں کہ وہ ایک دن اور رُک گیا ہے اور کل آ جائے گا۔ کیونکہ بابرا بہت جلد گھبرا جاتی ہے......ملازمہ سے دروازہ نہ کھلنے کی خبر سن کر مسز بھسین نے سوچا تھا کہ پڑوسی کہیں گھومنے گئے ہوں گے۔ یا شاید سو رہے ہوں۔ یا جو بھی......۔

''ثوبی! آ جا اندر بیٹھیں۔'' سونو نے ثوبیہ سے کہا۔

''کھڑکی سے باہر دیکھیں گے۔'' وہ سر اثبات میں ہلا کر بولا......

''نہیں......ممی پاس......'' اُس نے جھٹکے سے سر نفی میں ہلایا۔

''ممی تو بولتی ہی نہیں......تو میرے پاس آ جا۔'' وہ اداس ہو کر بولا۔ اس کا چہرہ آج پیلا نظر آ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

''آ نا ثوبی......آ جا۔'' وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگا......ثوبیہ ماں کے پھیلے ہوئے بازو پر سر رکھے اپنا انگوٹھا چوستی رہی اور سر نفی میں ہلا ہلا کر بھائی کو دیکھتی رہی......۔

سونو اس کے قریب جا کر اسے اٹھانے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ ممی کے پاس سے خراب سی بو آ رہی تھی۔ ممی نہائی نہیں نا کل سے......کپڑے بھی نہیں بدلے......ہم بھی نہیں نہائے......اس نے اپنا گریبان سونگھا......وہاں اُسے پرسوں کے لگائے ہوئے بے بی پاوڈر کی ہلکی سی مہک آئی......اس نے پھر ممی کی طرف دیکھا......ممی کی شکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ایک دو الٹے قدم اٹھاتا ہوا دیوار سے لگ گیا۔ اس کی نظریں ماں کے چہرے پر گڑھی تھیں۔ وہ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچ گیا......اور دیوار سے پھسلتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں عجیب قسم کا خوف سا چھا رہا تھا۔ اسے نیند بھی آ رہی تھی۔ مگر وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ آنکھ لگنے لگتی تو فوراً آنکھیں کھول کر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگتا......دور بیٹھا ہوا۔ وہاں سے ماں کے تلوے نظر آ رہے تھے اور پھر ماں کا باقی جسم۔ بعد میں چہرہ۔ ٹھوڑی سے شروع ہوتا ہوا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں پر

رکھ دیے۔اور...... پھر پتا نہیں کب وہ دیوار سے لگا لگا فرش پر آ گیا۔اس کے گھٹنے اس کے سینے سے لگے ہوئے تھے اور وہ سو چکا تھا۔

صبح پھر دروازے کی کال بیل لگا تار کچھ پل بجی تو وہ بیدار ہوا۔دروازے تک گیا اور بے چارگی سے اسے دیکھتا رہا۔کچھ منٹ بعد لوٹ آیا......گھر میں ہوتا تو کھڑکی سے نانی کو آواز لگاتا۔یہاں تو نہ وہ دروازہ کھول سکتا تھا نہ کھڑکی۔کھڑکی کھول بھی لیتا تو اس کی آواز کون سن پاتا کہ کھڑکی سے نظر آنے والے لوگ اس کی آواز کی رسائی سے بہت دور تھے۔

آج ثوبیہ ابھی تک سو رہی تھی۔وہ دروازے پر ٹھہر کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ماں کا چہرہ بغیر پانی کے گلدان میں پڑے کئی دن پرانے پھول سا لگ رہا تھا۔وہ آہستہ آہستہ ماں کے کچھ قریب جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ممی کی شکل بدل گئی تھی۔یہ شکل کسی اور کی تھی۔میلے سے مٹیالے چہرے والی......اس کی ممی تو گوری تھی......تو کیا یہ اس کی ممی نہیں تھی......تو کیا اس کی ممی کی شکل کو کچھ ہو گیا ہے......یا......یا یہ کوئی اور ہے۔کوئی عجیب سی شے......انسان جیسی کوئی شے......۔

ذہن میں اس خیال کے آتے ہی وہ زور سے چیخ پڑا۔ثوبیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور رونے لگی۔وہ چیختا ہوا کمرے سے باہر بھاگا اور ڈرائنگ روم کے لمبے صوفے کے عقب میں جا چھپا۔اس کا چھوٹا سا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔ثوبیہ کچھ دیر روتی رہی پھر اٹھ کر بھائی کو ڈھونڈنے لگی۔

''بیا۔بیا۔'' وہ باورچی خانے میں گئی اور روتے روتے بھائی کو پکارنے لگی۔وہاں اُسے نہ پا کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

''بیا۔آ۔آ'' اس نے نحیف سی آواز میں پکارا۔

سونو صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔اس کے خوفزدہ دل میں احساس ذمہ داری نے قوت بھر دی۔بہن کو دیکھ کر اس کے قریب چلا گیا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔اسے محسوس ہوا کہ اس کی ثوبی کو بہت تیز بخار ہے۔

''بیا۔پانی۔'' وہ ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔

''تجھے بخار ہے......آ جا۔ادھر لیٹ جا......میں پانی لاتا ہوں۔''

اس نے صوفے پر چڑھنے میں بہن کی مدد کی اور باورچی خانے کی طرف گیا۔

خوابگاہ کے قریب سے گذرتے وقت اس نے ایک ادھوری سی نظر کمرے کی طرف تیزی سے ڈالی پھر ریفریجریٹر کے پاس چلا گیا اور بوتل نکال کر پانی گلاس میں انڈیلنے لگا۔ ساری بوتل خالی کر کے ہی کہیں گلاس بھر سکا تھا۔

گلاس اور چمچہ لئے وہ بہن کے پاس آ گیا اور اُسے دھیرے دھیرے پانی پلانے لگا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ چمچ وہ خود بھی پیتا رہا۔

''بھوک لگی ہے؟'' اس نے نہایت محبت سے ثوبیہ سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

صبح جب دروازے کی گھنٹی سن کر سونو بے بسی سے پلٹ آیا تھا اس وقت مسز بھسین کے ہاں پھر امان نے ٹیلی فون کیا تھا۔ اور پھر مسز بھسین نے اپنی جز وقتی ملازمہ کو اوپر روانہ کیا تھا جو لگا تار تین چار گھنٹیاں بجا کر لوٹ آئی تھی۔

ثوبیہ ڈرائینگ روم کے صوفے پر نڈھال پڑی تھی۔

سونو ذمہ دار بھائی کی طرح اس کے قریب بیٹھا تھا۔ بیچ بیچ میں دونوں اونگھ لیتے۔ شاید مسلسل نقاہت یا رات بھر گھٹی ہوئی آلودہ فضا میں رہنے کے باعث ان کی ایسی حالت ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی سونو سر گھما کر چور نظروں سے بیڈ روم کی طرف دیکھتا اور جلدی سے چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ وقفے وقفے سے اس کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

اس بار ثوبیہ جاگی تو پھر رونے لگی۔

''دودھ پیئے گی ثوبی۔؟'' اس نے آواز میں پیار بھر کر کہا۔

''مگر دودھ تو ہے ہی نہیں۔ اچھا ٹھہر جا میں کچھ اور دیکھتا ہوں۔'' ثوبیہ نے کچھ نہ کہا۔ سونو کو خود بھی بہت بھوک لگ رہی تھی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور پلاسٹک کی میز کھینچ کر نعمت خانے کی الماری کے ٹھیک نیچے تک لے گیا۔

بسکٹ کا ڈبہ لے کر جب وہ خوابگاہ کے باہر سے گذرا تو اس نے بے اختیار سا ہو کر اندر نگاہ دوڑائی حالانکہ وہ وہاں سے سیدھا ڈرائینگ روم میں بھاگ آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے پتہ تھا اندر اس کی ممی نہیں۔ پتہ نہیں کون ہے اور کیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ بیڈ پر پڑی ہوئی ممی جیسی کوئی چیز جیسے دب کر پھیل گئی تھی۔ بند آنکھیں جیسے بڑے بڑے ابھرے

ہوئے دائروں میں دھنسی پڑی تھیں۔اس چیز کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ جانے کس رنگ کے تھے...... دوسرے ہی پل اس نے منہ دوسری طرف موڑا اور پوری طاقت لگا کر ڈرائینگ روم کی طرف بھاگا۔اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

شاید وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا مگر بخار میں چپ چاپ لیٹی ہوئی بہن نے اس کے حواس کو قابو میں رکھا۔چیخ اس کے ننھے سے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔

وہ بہن کے قریب چلا گیا اور باچھیں کھول کر مسکرانے لگا تو اس کے سوکھے لب سفید ہو رہے تھے۔

''بسکٹ۔لایا ہوں۔'' وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کھائے گی۔'' وہ پیار سے پوچھنے لگا۔اور ثوبیہ ٹکر ٹکر بھائی کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف

(۱) پریم ناتھ پردیسی (۱۹۰۹......۱۹۵۵)

پردیسی نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز ڈوگرہ دور میں شاعری سے کیا۔لیکن بعد میں انہوں نے باقاعدہ افسانہ نگاری شروع کردی۔ان کا پہلا افسانہ ''سچی پراتھنا'' روزنامہ ''رنبیر'' جموں، جلد ۷، نمبر ۳۶، اپریل ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔پردیسی نے ابتداء میں کئی فرضی نام اختیار کیے جن میں پریم ناتھ سادھو، رونق کشمیری، بابو، علائی، علامہ علائی، پردیسی کاشمیری، بالک رام باری قابل ذکر ہیں۔ پردیسی کے تین افسانوی مجموعے ''دنیا ہماری'' (۱۹۴۰)، ''شام وسحر'' (۱۹۴۱) اور ''بہتے چراغ'' (۱۹۵۵) چھپ چکے ہیں۔ان کا ایک ناول ''پوتی'' لاہور میں شائع ہوا ہے۔مزید بچوں کیلئے بھی کچھ کتابیں تحریر کیں۔ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب ''پریم ناتھ پردیسی ......عہد، شخص اور فنکار'' ۲۰۰۹ء میں ڈاکٹر پریمی رومانی نے ترتیب دیکر شائع کی ہے۔

(۲) پریم ناتھ در (۱۹۱۴......۱۹۷۶)

پریم ناتھ در کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے ایک ایسے خاندان سے رہا ہے جس کا واسطہ کشمیر کی تاریخ کے مختلف موڑوں پر شاہی درباروں سے رہا ہے۔ اس خاندان میں جاگیردارنہ نظام کو استوار کرنے والے بھی پیدا ہوئے اور اس سے بغاوت کرنے والے بھی۔در نے بحیثیت افسانہ نگار آتے ہی پورے ادبی منظر نامے میں ہلچل پیدا کردی۔ پریم ناتھ در کے تین افسانوی مجموعے ہیں جن میں کاغذ کا واسدیو (۱۹۴۹)، نیلی آنکھیں (۱۹۶۰) در کی زندگی میں ہی شائع ہوئے۔جبکہ ''چناروں کے سائے میں'' جی آر حسرت گڈھا نے ۱۹۹۹ء میں ترتیب دی۔

(۳) ٹھاکر پونچھی (۱۹۲۲......۱۹۷۳)

ٹھاکر پونچھی ریاست کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے افسانوں کے دامن کو وسعت دے کر ناول لکھنے شروع کئے۔ ان کے قریباً ایک درجن ناول شائع ہوئے جن میں رات کے گھونگھٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سایے، پت جھڑ کے بچھڑے، قفس اداس ہے، یہ رشتے یہ لوگ، وادیاں اور ویرانے، یہ من بڑا چنچل ہے اور ڈیڈی قابل ذکر ہیں۔ ٹھاکر پونچھی کی پہلی کہانی ''کالکی'' ہفتہ وار ''چاند'' میں شائع ہوئی۔ ٹھاکر کے تین افسانوی مجموعے زندگی کی دوڑ، چناروں کے چاند اور یادوں کے کھنڈر ہیں۔ ''موت کے سائے'' (افسانہ) پر انہیں ایک کل ہند افسانوی مقابلے میں پہلا انعام ملا۔ ان کی تخلیقات کا ترجمہ بنگالی، پنجابی، ملیالم اور ہندی زبانوں میں ہوا ہے۔

(۴) موہن یاور (۱۹۲۷...... ؟)

موہن یاور نے تقسیم سے قبل لکھنا شروع کیا۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ہیں جن میں وہسکی کی بوتل (۱۹۵۸)، سیاہ تاج محل (۱۹۶۱)، تیسری آنکھ اور دو کنارے ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے ایک ناول ''پتھروں کا شہر'' بھی لکھا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں ایک افسانوں انتخاب ''توی اور جہلم'' کے عنوان سے بھی ترتیب دیا۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے افسانوی مجموعے ''سیاہ تاج محل'' پر انعام بھی ملا ہے۔

(۵) تیج بہادر بھان (۱۹۳۱...... ؟)

تیج بہادر بھان نے ابتداء سے ہی رومانیت سے انحراف کرتے ہوئے اپنی ایک الگ روش اختیار کی۔ جس سے وہ جلد ہی ادبی منظرنامے پر چھا گئے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''جہلم کے سینے پر (۱۹۶۰) اور عورت (۱۹۶۲) ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک ناول ''سیلاب اور قطرے'' ۱۹۶۷ء میں چھپا ہے۔ مزید ان دو نثری کتابیں ''پہچان'' اور ''حرف آخر'' انسان کی نفسیات پر مبنی ہے۔

(۶) حامدی کاشمیری (۱۹۳۲)

عصری تنقیدی دبستان میں جن سرکردہ نقادوں نے اپنا لوہا منوایا ہے ان میں حامدی کاشمیری سرفہرست ہیں۔ حامدی صاحب کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تیس تنقیدی کتابیں، دس شعری مجموعے، تین افسانوی مجموعے، پانچ ناول اور ایک سفر نامہ

بھی شامل ہے۔ حامدی صاحب کا پہلا افسانہ ''ٹھوکریں'' ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ ''شعاعیں'' میں شائع ہوا۔ ان کے تین افسانوی مجموعوں کے نام وادی کے پھول (۱۹۵۷)، سراب (۱۹۵۹) اور برف میں آگ (۱۹۶۱) ہیں۔ حامدی صاحب کو کئی ریاستی اور ملکی اعزازات و انعامات سے بھی نوازا گیا۔

(۷) پشکرناتھ (۱۹۳۲......2005)

پشکرناتھ کی ادبی زندگی برج پریمی کے چیلنج سے شروع ہوئی۔ جب برج پریمی نے پشکرناتھ سے کہا کہ تم کہانی نہیں لکھ سکتے تو انہوں نے اپنی پہلی کہانی ''اور کہانی ادھوری رہ گئی''، تحریر کی جو بعد میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' فروری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ پھر پشکر ناتھ نے مڑکر نہیں دیکھا بلکہ چار افسانوی مجموعے منظر عام پر لائے۔ ان میں اندھیرے اجالے، ڈال کے باسی، عشق کا چاند اندھیرا، کانچ کی دنیا خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے کئی ٹی۔ وی، ریڈیو ڈرامے بھی تحریر کئے۔ کلچرل اکیڈیمی ایوارڈ اور یوپی اردو اکادمی ایورڈ بھی ملے ہیں۔

(۸) نور شاہ (۱۹۳۶)

نور شاہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاہدہ شرین کے فرضی نام سے کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے فرضی نام سے کنارہ کشی کرتے ہوئے اردو افسانہ کے میدان میں کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کے چھے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اداس اداس، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ اور آسمان، پھول اور لہو خصوصیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ چار ناول بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے انہوں نے ''انتخاب اردو ادب'' بھی ترتیب دی ہے۔ ریاست کی ادبی تاریخ کے اہم شاہد ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ڈائری ''بند کمرے کی کھڑکی'' کے عنوان سے قلم بند کی، جو ۲۰۰۷ میں شائع ہوئی۔ اور خاکوں کے حوالے سے ایک اہم کتاب ''کہاں گئے وہ لوگ'' ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر لائی۔ مزید روزنامہ کشمیر عظمیٰ میں متواتر پانچ برسوں سے ادبی کالم تحریر کر رہے ہیں۔

(۹) مخمور بدخشی (۱۹۳۸)

مخمور بدخشی کی ابتدائی کہانیوں سے ہی معروف و مشہور محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر

محی الدین قادر زور اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے بدخشی صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ ''نیل کنول مسکائے'' اردو کے معروف ادارہ ''ادارۂ ادبیات اردو'' حیدرآباد سے ۱۹۶۲ء میں شائع کروایا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ بدخشی صاحب ان دنوں ایم ،اے کے طالب علم تھے اور پروفیسر موصوف کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں صدر تھے۔ بدخشی صاحب کے افسانوی مجموعے کی دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ جس کہانی کے عنوان پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے وہ افسانہ کتاب میں شامل ہی نہیں ہے۔ موصوف آجکل کشمیر کی تاریخ ''فردوس بروئے زمین است'' تحریر کررہے ہیں۔

(۱۰) شبنم قیوم (۱۹۳۸)

شبنم قیوم کا پہلا افسانہ ''اخبار کی سرخی'' روزنامہ ''خدمت'' میں شائع ہوا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''ایک زخم اور سہی'' (۱۹۷۱) اور ''نشانات'' (۲۰۰۷) میں شائع ہوئے۔ انہوں نے ایک نیم سیاسی ناول ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا'' بھی لکھا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کشمیر کی سیاسی صورت حال پر کئی کتابیں تحریر کیں ہیں جن میں ''کشمیر کا سیاسی انقلاب'' پانچ جلدوں پر مبنی ہے۔ آج کل ہفتہ روزہ ''قومی وقار'' کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔

(۱۱) عمر مجید (۱۹۴۰......۲۰۰۸)

عمر مجید کی پہلی کہانی ۱۹۶۵ء میں روزنامہ آفتاب میں ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ابتداء سے تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ صحافتی زندگی کو بھی اپنانا۔ روزنامہ ''آفتاب'' میں قریب تین دہائی بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر وابستہ رہے۔ ساتھ ہی بحیثیت مدرس ۴۰ سال تک کام کیا۔ ۱۹۶۸ء میں پہلا افسانوی مجموعہ ''اجالوں کے گھاؤ'' شائع کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۰ء میں ''یہ بستی یہ لوگ'' اور ۱۹۷۶ء میں درد کا دریا'' کے عنوان سے دو ناول منظر عام پر لائے۔ وفات کے بعد سلیم سالک نے ''عمر مجید کے بہترین افسانے'' ۲۰۰۹ء میں مرتب کی۔

(۱۲) وریندر پٹواری (۱۹۴۰)

وریندر پٹواری کشمیر کے بسیار نویس افسانہ نگار ہیں۔ کشمیر سے ہجرت کرنے کے بعد دلی میں ایک حادثے کے شکار ہوئے جس سے قوت گویائی سے محروم ہونا پڑا۔ اپاہج ہونے کے بعد بھی اپنے تخلیقی سفر کو شدومد سے جاری رکھا۔ ان کے چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر

آچکے ہیں۔جن میں فرشتے خاموش ہیں، دوسری کرن، بے چین لمحوں کا سفر، آواز سرگوشیوں کی، ایک ادھوری کہانی اور افق ہیں۔اس کے علاوہ ان کے دو ڈراموں کے مجموعے ''آخری دن'' اور ''انسان'' شائع ہوئے ہیں۔

(۱۳) ظہورالدین (۱۹۴۲)

ظہورالدین ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کا پہلا افسانہ ''تلافی'' شائع ہوا۔انہوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ تحقیقی اور تنقیدی کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔ان کے افسانوں میں علامت کا صحیح ادراک ملتا ہے۔افسانوں کے دو مجموعے ''تلافی'' اور ''کینی بلز'' کے عنوان سے شایع ہو چکے ہیں۔۔ بحیثیت صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

(۱۴) عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ کی پہلی کہانی ''جلن'' ماہنامہ ''دیش'' سرینگر میں شائع ہوئی۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''زوجیلا کے آر پار'' (۱۹۷۵) اور ''دوراہا'' (۲۰۰۳) منظر عام پر آچکے ہیں۔اس کے علاوہ دوناول بھی شائع ہوئے ہیں۔ ''قلم قلم کار اور کتاب'' ان کی دلچسپ کتاب ہے جس میں ادیبوں کے تخلیقی محرکات کو دلنشین انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔انہوں نے لداخ کے حوالے سے بھی کئی کتابیں تحریر کیں ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

(۱۵) حسن ساہو

حسن ساہو وادیٔ کشمیر کے سنجیدہ اور بالغ نظر افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔اور ساتھ ہی سماجی کارکن کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔کئی برسوں سے ہفتہ روزہ ''دوران'' کی ادارت بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔انکا پہلا افسانہ ''پاگل'' ماہنامہ ''بانو'' دہلی میں شش و پنج کشمیری کے نام سے شائع ہوا۔ان کے چار افسانوی مجموعے ''بستی بستی صحرا صحرا، پھول کا ماتم، اندھا کنواں اور گردش دوراں منظر عام پر آچکے ہیں۔

(۱۶) خالد حسین (۱۹۴۵)

خالد حسین کی پہلی کہانی ۱۹۶۹ء میں شایع ہوئی۔انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی لکھنا شروع کیا۔انکے دو افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' (1981) اور

''اشتہاروں والی حویلی'' (۱۹۹۱) شائع ہو چکے ہیں۔ان کے افسانوں میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھر محل انداز میں ملتا ہے۔مزید ان کے پنجابی زبان میں چار افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔کلچرل اکیڈیمی کے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

(۱۷) جان محمد آزاد (۱۹۴۸)

جان محمد آزاد کا پہلا افسانہ ''جمی'' اسلامیہ کالج کے میگزین ''بادام واری'' میں شائع ہوا۔ پھر ان کے اکثر و بیشتر افسانے روزنامہ ''آفتاب'' میں متواتر چھپتے رہیں۔۲۰۰۹ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آشیاں سے آسماں تک'' منظر عام پر آیا۔اس کے علاوہ ان کے تین ناول وادیاں بلا رہی ہیں، کشمیر جاگ اُٹھا اور ظلمات کے مسافر شائع ہو چکے ہیں۔صحافت کے حوالے سے انہوں نے ایک اہم کتاب ''آداب صحافت'' بھی تحریر کی ہے۔ان کا ایک شعری مجموعہ ''الوداع موسمی پنچھی'' ۱۹۹۹ء چھپا۔کلچرل اکیڈیمی کے زیر اہتمام ''جموں و کشمیر کے اردو مصنفین'' (۲۰۰۴) بھی ترتیب دی۔

(۱۸) اشوک پٹواری (۱۹۴۸)

اشوک پٹوری کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہوا۔پنڈتوں میں پٹواری خاندان علم و ادب کا گہوارہ مانا جاتا تھا۔ ان کے والد مسرور کشمیری اور بڑے بھائی وریندر پٹوری دونوں ادب میں خاصا نام کما چکے ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کچھ لمحے کچھ سائے '' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔ان کے افسانے ملکی اور بین الاقوامی سطح کے جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔پیشے سے ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔

(۱۹) شمس الدین شمیم (۱۹۴۹)

شمس الدین شمیم کی پہلی کہانی ''باون گز کے دیوتا'' روزنامہ آفتاب میں شائع ہوئی۔ ''ویرانے'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آیا۔کئی سال روزنامہ آفتاب کے ادبی ایڈیشن اور خواتین ایڈیشن کے انچارج بھی رہے۔اس کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی افسانے تخلیق کرتے ہیں۔انہوں نے کئی ڈرامے ریڈیو اور ٹی وی کے لئے بھی تحریر کئے ہیں۔

(۲۰) راجہ نذر بونیاری (۱۹۴۹)

راجہ نذر بونیاری کی پہلی کہانی ''کلائمکس'' بیسوی صدی میں ۱۹۶۷ء کو شائع ہوئی۔نذر

صاحب افسانوں کے علاوہ سیاسی کالم اور مضامین بھی لکھتے ہیں۔ان کا متواتر کالم ہفتہ روزہ ''چٹان'' میں آتا ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''دوسرا آدمی'' (۱۹۷۲) اور ''یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں'' (۲۰۰۹) شائع ہوئے ہیں۔ کلچرل اکیڈیمی کے پہاڑی شعبہ میں ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

(۲۱) دیپک بدکی (۱۹۵۰)

دیپک بدکی کی پہلی کہانی ''سلمیٰ'' روزنامہ ہمدرد میں ۱۹۷۰ ء میں شائع ہوئی۔ پھر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۶ تک لکھنا ترک کیا۔ لیکن جب جمود ٹوٹا تو پھر کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ جن میں تین افسانوی مجموعے ادھورے چہرے (۱۹۹۹)، چنار کے پنجے (۲۰۰۵) اور زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (۲۰۰۷) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ دو تنقیدی کتابیں ''عصری تحریریں'' (۲۰۰۶) اور ''عصری شعور'' (۲۰۰۹) بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۲۲) آنند لہر (۱۹۵۴)

آنند لہر ریاست کے بسیار نویس تخلیق کار ہیں۔ان کے تین افسانوی مجموعے انحراف، سرحد کے پار اور کوٹ مارشل شائع ہو چکے ہیں۔ان کے علاوہ چار ناول اور دو ڈراموں کے مجموعے بھی داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کو کئی اداروں سے اعزازات اور انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ جن میں یوپی اردو اکادمی، رسا میموریل سوسائٹی ایوارڈ اور راجستھان اُردو اکادمی ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔

(۲۳) مشتاق مہدی (۱۹۵۲)

مشتاق مہدی کی پہلی کہانی ''کمینہ'' ماہنامہ ''فلم سنسار'' ممبئی میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں سید یعقوب دلکش اور غلام نبی شاہد کے ساتھ ایک مشترکہ افسانوی مجموعہ ''مٹی کے دیئے'' منظر عام پر لایا۔ جس میں مشتاق مہدی کی پانچ کہانیاں شامل ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ایک اور افسانوی مجموعہ ''آنگن میں وہ'' منظر عام پر آیا۔اس کے علاوہ کشمیری شاعری کا مجموعہ ''نغمہ دل'' بھی چھپ چکا ہے۔ شعر و افسانہ کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے سیریل بھی لکھتے ہیں۔

(۲۴) غلام نبی شاہد (۱۹۵۲)

غلام نبی شاہد کی پہلی کہانی ''کتنے جھنڈے'' ۱۹۷۳ء میں روزنامہ آفتاب میں شائع

ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں سید یعقوب دلکش اور مشتاق مہدی کے ساتھ ایک مشترکہ افسانوی مجموعہ ''مٹی کے دیئے'' شائع کیا۔ جس میں شاہد صاحب کی چار کہانیاں شامل ہیں۔ افسانوں کے علاوہ ٹی وی اور ریڈیو کے لئے بھی سیریل لکھ رہے ہیں۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ''میں نے خواب میں ابابیلیں دیکھیں'' طباعت کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے۔

(۲۵) زاہد مختار (۱۹۵۶)

زاہد مختار نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعری تخلیق سے کیا۔ لیکن جلد ہی انہوں نے نثر کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کے افسانے ملک کے اعلیٰ پائے رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''جہلم کا تیسرا کنارہ'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کا شعری مجموعہ ''سلگتے چنار'' قارئین سے داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ ان کی ادارت میں ہفتہ روزہ ''المختار'' اور ماہنامہ ''لفظ لفظ'' شائع ہوتے ہیں۔

(۲۶) ترنم ریاض (۱۹۶۳)

ترنم ریاض وادی کی نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں میں سرفہرست ہیں۔ انکے چار افسانوی مجموعے یہ تنگ زمین، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، میرا رخت سفر اور یمبرزل ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ انہوں نے ''بیسوی صدی میں خواتین کا اردو ادب'' کے عنوان سے بھی کتاب مرتب کی ہے۔ مزید ان کے کئی ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

Jammu Kashmir Ke Muntakhab Urdu Afsane
By. Saleem Salik

مرتب ایک نظر میں

نام: محمد سلیم خان

قلمی نام: سلیم سالکؔ

ولدیت: غلام نبی خان

پیدائش: چھتہ بل، سرینگر کشمیر

تعلیم: ایم، اے (اُردو)۔ ایم فل۔ نیٹ

شغل: تحقیق وتنقید، ادبی صحافت

کتابیں: (۱)..... فرید پربتی: شعر، شعور اور شعریات (مرتب: ۲۰۰۶ء)

(۲)..... کتاب دریچہ (ادبی کالموں کا انتخاب) (مرتب: ۲۰۰۹ء)

(۳)..... عمر مجید کے بہترین افسانے (مرتب: ۲۰۰۹ء)

(۴)..... جموں وکشمیر کے منتخب اُردو افسانے
پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک (۲۰۱۱ء)

زیرِ طبع: (۱)..... اُردو افسانہ۔ مزاج ومنہاج (مذاکرے)

(۲)..... جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کا سفر (تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

(۳)..... شعروں کے انتخاب نے! (ضرب المثل اشعار کا گلدستہ)

سکونت: فرینڈس کالونی، لین 1، ایچ ایم ٹی روڈ شالٹینگ سرینگر

ای میل: salimsalik@gmail.com

فون نمبر: 9205387539

Designing by B.Q.C 9419707173

Meezan Publisher
Opp. Fire & Emergency Services
H.Q. Batamaloo, Srinagar Kashmir. 190009
Telephone: 0194-2470851, 9419002212 Fax: 0194-2457215
email: meezanpublishers@rediffmail.com

ISBN 93-80693-06-8